بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

1981

ترتیب

اسرار التنزیل	مولانا محمد اکرم صاحب
باتیں ان کی خوشبو خوشبو	حضرت شیخ المکرم مدظلہ
ہدایت اور صراط مستقیم	مولانا محمد اکرم صاحب
امثال عرب	مولانا عبدالحفیظ رحمانی
تصوف اور تعمیر سیرت	مولانا حافظ عبدالرزاق صاحب
خدایا ایں کرم بار دگر کن	ابوسعید ایم اے
گفتگو	حافظ عبدالرزاق
پروگرام تبلیغی دورہ	ناظم اعلیٰ

اداریہ

شاندار مستقبل کے لئے لوگ عظیم اور معروف علمی اداروں اور فنی تربیت گاہوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کرتے ہیں تاکہ کامیاب ہوکر کوئی سند، ڈپلومایا ڈگری حاصل کریں اور اپنا مستقبل روشن کرلیں

حصول علم و فن بلاشبہ بڑا عظیم مقصد ہے مگر سیکھنے والے کچھ ایسے سہل انگار واقع ہو رہے ہیں جیسے کوئی جنت الحمقاء میں بستا ہو۔ یعنی کریں کوئی کچھ نہیں اور مل جائے سب کچھ۔ چنانچہ ایسے اولوالعزم تو آٹے میں نمک کے برابر پائے جاتے ہیں جو پوری محنت سے کام کرتے ہیں اور بڑے شوق سے امتحان کا انتظار کرتے ہیں۔ زیادہ تعداد ان کم ہمت اور کام چور لوگوں کی ہوتی ہے جو امتحان کو ٹالنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہوں نے داخلہ نہ لیا ہوتا تو اس تکلف کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میڈیکل سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے اور پیش کرنے کی تدبیر تو عام بھی ہے اور آسان بھی۔ ان سے بھی زیادہ تعداد ایسے بھگوڑوں کی ہے کہ جو امتحان سے جان بچانے کی مہم چلایا کرتے ہیں اور سٹرائیک کرانا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ قوم میں روز بہ روز اس مخلوق کا اضافہ ہو رہا ہے

امتحان کی بات چلی تو ذہن آنے والے قمری مہینے رمضان کی طرف چلا گیا۔ جن لوگوں نے پورے شعور سے درس گاہ محمدی میں داخلہ لیا یا حادثہ پیدائش کی وجہ سے اس زمرہ میں شمار ہونے لگے ان سے کس پیارے انداز سے خطاب ہو رہا ہے کہ اے میرے محمد سے پیمان وفا باندھنے والو! (یاایھاالذین اٰمنوا) تمہارے امتحان کا موسم آگیا (کتب علیکم الصیام) امتحان کس امر کا؟ امتحان اس بات کا کہ تم خواہشات کے غلام بن کر ڈنگروں ڈھوروں کی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش کرتے ہو یا خواہشات پر قابو پانے کا سلیقہ سیکھ کر محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہو اگر تم نے احساس ذمہ داری سے کام لیا تو تم کامیاب ہو جاؤ گے اور تمہیں ایک عظیم الشان سند

عطا کی جائے گی۔ (لعلکم تتقون) کہ تمہاری سیرت کی تعمیر اس انداز سے ہوگی کہ تم احتیاط مجسم بن جاؤ گے۔ ایسے محتاط کہ عملی زندگی کے جس پہلو میں تمہارا جو قدم اٹھے گا تمہیں دیکھنا ہوگا کہ یہ قدم اللہ اور رسولؐ کی اطاعت میں اٹھ رہا ہے یا مخالفت میں اور تمہارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ آگے بڑھوں یا رک جاؤں۔ کیونکہ اس ایک مہینہ کی مسلسل مشق سے تمہارے قلب کا تعلق اپنے رب سے اتنا راسخ ہو چکا ہوگا کہ اگر پہلی صورت ہوئی تو تمہارا قدم خود بخود آگے بڑھے گا اور اگر دوسری صورت ہوئی تو ایک ان دیکھی قوت جو تمہارے قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو چکی ہوگی تمہارے قدم کو آگے بڑھنے سے روک دے گی۔ گویا اس مہینے کے امتحان پر تمہاری ساری زندگی کے سنورنے یا بگڑنے کا انحصار ہے۔

ہماری بدنصیبی کا کیا کہنا کہ شوق سے امتحان میں بیٹھنے والے تو بس خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اور بھگوڑوں کی تعداد شمار میں نہیں آسکتی۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ آرڈیننس جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کو اللہ اور رسول کو برملا آنکھیں دکھانے سے باز رکھنے کے لئے قوت اور قانون کا استعمال کیا جائے۔

مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے۔

—x—

مولانا محمد اکرم

اسرار التنزیل

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم النبییّن اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ طٰـہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ ۝ الّا تذکرۃ لمن یخشیٰ ۝ تنزیلاً ممّن خلق الارض والسمٰوٰت العُلیٰ ۝ الرّحمٰن علی العرش استویٰ ۝ لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینھما وما تحت الثریٰ ۝ وان تجھر بالقول فانہٗ یعلم السّرّ واخفی ۝ اللہ لا الٰہ الّا ھوؕ لہ الاسمآء الحسنیٰ ۝ صدق اللہ العظیم۔

سورۃ طٰہٰ بلحاظ نزول کے مکی سورتوں میں سے ہے اور جن ابتدائی آیات کی تلاوت کا شرف میں نے حاصل کیا ہے یہی وہ آیات ہیں جنھیں سُن کر سیدنا عمرؓ بن الخطاب جیسا جری انسان لرزہ براندام ہو گیا تھا اور ہیبت الٰہی سے بجز دامانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں پناہ نظر نہ آئی۔ یہ ایک معروف واقعہ ہے جو تمام کتب سیر اور اکثر تفاسیر میں درج ہے اور واقعی ان چند آیات میں ایسے اسرار پوشیدہ ہیں کہ جاننے اور سمجھنے والا آسانی سے برداشت نہیں کر پاتا، عظمت و سطوت باری، ملک خداوندی اور علوم الٰہی کی ہمہ گیری یہ سب مل کر انسان کے لئے بجز اطاعت کوئی جائے مفر نہیں چھوڑتے۔

سب سے پہلی آیت حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو خطاب فرمائی ہے کہ اے حبیب قرآن اس واسطے نازل نہیں فرمایا کہ تو محنت و مشقت میں پڑ جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر محنت فرماتے ادائے عبادات، نوافل و اذکار، تلاوت کر کر راتیں تمام ہو جاتیں اور سارا سارا دن تبلیغ دین کے لئے صحرا نوردی کی نذر ہو جاتا ایک ایک متنفس کے لئے تڑپ جاتے اور میلوں فاصلہ طے کر کے اس تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی سعی فرماتے۔

اکثر قافلوں کے پڑاؤ ڈالنے کی اطلاع پا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو ان کے پڑاؤ میں تشریف لے جاتے حتیٰ کہ اللہ کریم نے فرمایا اے میرے محبوب اس قدر مشقت نہ فرمایئے جو آپ کے قدموں کو متورّم کر دے اور جسم اطہر کی قوت برداشت سے بڑھنے لگے۔ کہ ہدایت تو اُسے نصیب ہو گی جو عظمتِ باری کا کوئی شمہ پالے گا تو اس کی جلالت کے سامنے اپنے کو لاشئے محض دیکھ کر ہیبت الٰہی سے اس کا دل لرز اُٹھے گا یہ حالت یقیناً ایک طلب پیدا کر دے گی۔ کہ اب میں کیا کروں کہ یہ عظیم ذات مجھ پر خفا نہ ہو اور اپنے دامانِ رحمت میں جگہ بخشے اس کا جواب قرآن کریم دے گا اور ایسے طالبوں کی

رہنمائی فرمائے گا - یہاں دو امور مستفاد ہوتے ہیں - اولاً یہ کہ منازل قرب کے حصول کے لئے سخت مجاہدے کی ضرورت ہے جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہر حال ادا کرنے ہیں حصولِ قرب کے لئے تو ایسی محنت کی ضرورت ہے جو اس سے بہت زیادہ ہو نوافل میں، اذکار میں اور اشاعتِ دین میں اگر کوئی اسے دیکھ لے تو اس کا وجود مجسم تبلیغ ہو۔ اس کی عبادت باعثِ اصلاحِ خلق ہو اور اس کا کلام دعوت الی الحق ہو - فی زماننا مفہوم کچھ بدل گئے ہیں اور روایات کی جگہ حکایات نے لے لی ہے - اب عظمت کی دلیل گوشہ نشینی عُزلت گیری اور زندگی سے فرار کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ حق بات یہ ہے کہ متقدمین صوفیاء میں سے بھی جن حضرات نے تنہائی اور خلقِ خدا سے دُوری اختیار کی وہ منازل کی اسی حد پہ رہے جہاں وہ تھے - اس سے آگے ترقی نہ کر سکے کیونکہ ترقی کا مدار ہی شریعتِ مطہرہ پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو اس کی دعوت دینا ہے صرف ذاتی عمل یا اپنے جسم کی محنت ہی کافی نہیں پھر تنہائی نے تو لین دین یا معاشرت اور مخلوقات کے حقوق کی ادائیگی جیسے اعمال سے بھی محروم کر دیا - ہاں ایک بات ہے کہ مکاشفات تیز ہو گئے اور عجائبات کا صدور ہونے لگا جو دونوں اُمور مقصود ہی نہ تھے - یہ بھی انعام باری مگر مقصود نہیں ہیں مقصودِ اصلی قرب الٰہی تھا جس میں ترقی نہ ہو سکی نیز یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو عباداتِ نفلی اور تبلیغ دین میں اس قدر مبالغہ فرمائیں کہ اللہ کریم فرما رہا ہے میرے محبوب اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالئے پھر کون ہے جو عبادات فرضی میں بھی متساہل ہو، نماز درست نہ ہو اگر ہو تو اوقات پر نہ ہو، باجماعت نہ ہو اذکار میں تغافل ہو اور پھر ترقی درجات کو متمنی بھی - ایسا ہونا محال ہے ہاں اپنی استطاعت بھر محنت کرے اور اللہ کے کرم کا اُمیدوار رہے نیز قرآن سے ہدایت اسی کو نصیب ہو گی جسے خشیتِ باری نصیب ہوئی کہ یہ تذکرہ لمن یخشیٰ ہے - اور خشیت کے لئے معرفت ضروری ہے خواہ کسی درجہ میں ہو جس درجہ میں معرفت حاصل ہو گی یعنی جس حد تک عظمتِ باری اس کے باطن میں جاگزیں ہو گی اسی مناسبت سے خشیت یعنی اس کی ناراضگی کا خوف بھی پیدا ہو گا اور جس درجہ کی خشیت ہو گی اسلام میں قرآن کریم سے اسرار رموز منکشف ہوتے چلے جائیں گے یہی وجہ ہے کہ لوگ چونکہ خشیت میں مختلف ہیں تو اخذ اسرار میں بھی تفاوت ہے نیز خشیت کے بے حد مدارج ہیں اس لئے فہم قرآن بھی کسی پر بس نہیں بلکہ ہر غواص جواہرات سے دامن پُر لاتا ہے اور معرفت کا واحد ذریعہ اتباع رسالت میں ذکر اسم ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہے واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔ گویا تبتل الی اللہ نصیب ہی کثرتِ ذکر سے ہوتا ہے اور انسانی بس میں معرفت کا بھی پہلو ہے کہ اللہ کے سامنے ماسوا اللہ کو فراموش کر بیٹھے ورنہ اللہ جل شانہ، کی کیفیت و کمیت کے بارے تو نہیں سوچا جا سکتا - رہی یہ بات کہ اس کے اسرار کیسے غیر منتہی ہیں تو چونکہ یہ کلام باری ہے اور اس کی صفت ذاتی ہے تو جیسے اس کی ذات حدود سے وراء ہے ایسے ہی اس کی صفات حدود سے بالاتر ہیں یہ اس کا نازل کردہ ہے جس ذات نے زمین کو پیدا فرمایا اور آسمانوں کی بلندیاں جس کے دستِ قدرت کی صنعت ہیں۔ جو عرش پہ قائم ہوا استویٰ علی العرش پہ یہ ایمان کہ حق ہے اور کیفیت اللہ ہی جانے - درست ہے نیز چونکہ مخلوق کے لئے عرش بمنزلہ قبلہ حاجات کے ہے اگر احکام نازل ہوتے ہیں تو عرش پر سے

رحمت متوجہ ہوتی ہے تو دیا ہے غضب نازل ہوتا ہے تو وہیں سے مخلوق دستِ طلب دراز کرتی ہے تو اسی طرف تو ایک طرح سے عرش قبلہ کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ اللہ اجسام و جہات سے ماوراء ہے ہاں عرش اس کا تختِ سلطنت ہے مگر ایسا جیسا اس کی شان کے مناسب ہے۔ اور وہ بہت بڑا رحم کرنے والا ہے اتنا کہ عاجز مخلوق کو اپنے کلام ذاتی کی لذتوں سے نوازتا ہے ورنہ اسے کیا غرض وہ تو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے رزاق ہے سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں جو آسمان میں ہے یا زمین میں یا ان دونوں کے درمیان یا زمین کی نچلی تہہ میں سب اس کی ملکیت ہے اور ہر شے کا وہی مالک ہے یہ حال تو اس کی سلطنت کا ہے اب وہ اس مخلوق کو اس طرح سنبھالے ہوئے ہے کہ کسی شے کی کوئی حرکت ہو یا سکون، ارادہ ہو یا خیال ظاہر کرے یا پوشیدہ سب کچھ جانتا ہے اس کا علم سب کائنات سے وسیع تر ہے جس کی نہ اول ہے نہ آخر اس کا علم ازلی ہے قدیم ہے۔ ایسے مخاطب تو بات کرے تو وہ سن رہا ہے تو دل میں پوشیدہ رکھے تو بھی وہ جانتا ہے بلکہ اس سے بھی باریک تر شئے تیرے وجود میں ہے جو تو نہیں جانتا مگر وہ اس سے واقف ہے۔ سِر اس بھید کو کہتے ہیں جو انسان خود جانتا ہو مگر دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہو مگر اخفیٰ وہ بھید ہے کہ جس کے سینے میں ہے وہ خود بھی اس کی حقیقت سے کما حقہ آگاہ نہیں اور یہ اس طرح ہے کہ ہر متنفس کو اللہ سے ایک نسبت باطنی حاصل ہے اور یہی نسبت حقیقت ایمان ہے اور اس قدر پوشیدہ کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ شیخ کو مرید کی حالت کا پتہ نہیں بلکہ نبی کو امتی کے اس حال کی خبر نہیں ہوتی بجز اس کے کہ اللہ آگاہ فرمادے جیسے فرمایا۔ سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون ہ یعنی ان لوگوں کو آپ ڈرائیں یا نہ برابر ہے کہ ان کی نسبت باطنی اب اس قدر ٹوٹ چکی ہے کہ بن نہیں سکتی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے خبر ہوتی تو یہ بتانا تحصیل حاصل ہے جو کلام باری میں ممکن نہیں سو اخفیٰ وہی بھید ہے جو بندے اور اس کے خالق کے درمیان ہے اور کتنے ایسے ہیں جو اپنے آپ کو نیک جانتے ہیں مگر عنداللہ مقبول نہیں ہوتے نتیجۃً خاتمہ بالایمان نصیب نہیں ہوتا اور کتنے ایسے ہیں جو بظاہر گناہ میں پڑے ہوتے ہیں مگر عنداللہ مقبول اور انہیں خاتمہ بالخیر نصیب ہو جاتا ہے سو یہ ایک خاص اندرونی تعلق ہے اور جیسا کسی کا تعلق ہوگا اسی طرح کی اس پر رحمت متوجہ ہوگی اسی لئے مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ ذکر اجتماعی میں فائدہ زیادہ ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس قدر افراد جمع ہوں گے اسی قدر نسبتیں ہوں گی اور ہر نسبت کا رنگ جدا سو رحمت باری کا ایک رنگا رنگ گلدستہ بن جائے گا۔

اسی طرح نماز باجماعت کی حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے اور یہ نسبت باطنی اس قدر مخفی ہے کہ خود صاحب نسبت بھی اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا اور بجز اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ اس عالم میں مکلف بالذات بدن ہے روح کے لئے بھی ذریعہ علم بدن ہے اور بدن کثیف ہے سو طرح کی خطائیں کرتا ہے نیز اس میں اس قدر علوم سے آگاہی کی استعداد ہی نہیں جس قدر اللہ نے روح کو بخشی ہے کہ روح جسم لطیف ہے اس کی استعداد بدن سے بہت ہی زیادہ ہے بدن عالم خلق سے سب سے مخصوص شئے یعنی مادہ سے

مرکب ہے جبکہ روح تو محض ... ہے۔ ہاں موت اس نسبت کو بدل دے گی۔ برزخ میں مکلف بالذات روح ہو گا اور بدن اس کے تابع وہاں حصول علم بذریعہ روح ہو گا تو روح اس کیفیت کو بھی جان سکے گی کہ میری پوشیدہ نسبت جسے اخفیٰ کا نام دیا ہے اللہ سے کس درجہ میں ہے۔

سو اگر برزخ میں کسی کو کلام کرنے کی قوت نصیب ہو اور اللہ کریم یہ دولت دیں تو اہل برزخ اپنی آئندہ حالت کے بارے میں یہ ضرور اور حتمی طور پر بتا سکتے ہیں کہ کبھی انہیں نجات نصیب ہو گی یا نہیں یہ ان لوگوں کی بات ہے جو عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے تو یہ بات وہ اسی نسبت کو جان کر بتا سکتے ہیں کہ اگرچہ نسبت اس درجہ کی نہ تھی کہ نجات کا سبب بنتی مگر خلود فی النار سے مانع ضرور ہو گی اور اگر بالکل منقطع ہو گئی تو پھر ہمیشہ دوزخ ہے اسی طرح صاحب نجات احباب بھی اپنے درجہ سے واقف ہونے کے ساتھ اپنی اس کیفیت یا نسبت سے بھی آگاہی رکھتے ہیں بلکہ اپنے سے بڑھ جانے والوں کو دیکھ کر رشک بھی کرتے ہیں جیسے حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اہل جنت کو جنت میں بھی یہ حسرت ہو گی کہ کاش میں نے بھی کچھ اور کر لیا ہوتا۔ تو یہ کسی قدر سر اور اخفا کی بات تھی حقیقت تو یہ ہے کہ ہے ہی فقط اللہ۔ کہ وہ قائم بالذات ہے باقی ساری کائنات اس کے سہارے سے قائم ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

لا آدم فی الکون ولا ابلیس
لا ملک سلیمان ولا بلقیس
فکل عبارات وانت المعنیٰ
یا من ہو للقلوب مقناطیس

سو حقیقتاً عبادت اللہ ہی کی ہے اور اس کی ہی چوکھٹ سر جھکانے کے قابل ہے باقی کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی عبادت کی جا سکے جس کے آگے دست سوال دراز کیا جا سکے اور تمام خوبصورتیاں یا کمال وہ اسی کے ہیں باقی جو بھی ہے سب محتاج ہے اسی کی مخلوق ہے جس کے دو حصے ہیں ایک اس بات تک پہنچے والے ظاہر ہے وہ نہیں چاہیں گے کہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرنے لگیں کیونکہ وہ تو داعی الی اللہ ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اور علماء امت، اب رہے دوسرے لوگ جو دوسری قسم کے ہیں اور جن کا کام دوسرا ہے یعنی اللہ کی راہ سے روکنا تو سوچا جائے تو وہ کب اس قابل ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پوجا شروع کر دی جائے مگر واحسرتا اس دور میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اپنی روٹی کھری کرنے کے لئے لوگوں کو قصے کہانیوں میں الجھا کر اللہ سے دور اور غیر اللہ کے در پر سجدہ ریز کر دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسا ان بدبختوں سے ہوتا ہے جو غفلت باری سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں اور جن کے قلوب قرآنی ہدایت کی استعداد نہیں رکھتے سو میاں سارے حقائق کی ابتداء اللہ اور سارے مقامات کی انتہا اللہ اول آخر، ظاہر باطن اللہ، جو تمام کمالات کا مالک ہے اور جسے سب خوبیاں سزاوار ہیں۔ یہ قرآن اس کا نازل کردہ ہے اور اس سے استفادہ کرنے کے یہ طریقے ہیں

اللہ ہمیں قرآن کی برکتوں سے نوازے آمین

اللّٰھم انصر الاسلام والمسلمین واخذل الکفرۃ والمشرکین آمین

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین

حضرت شیخ المکرم مدظلہٗ

باتیں ان کی خُوشبو خُوشبو

- صحابی کا لفظ صحبت سے مشتق ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں صحابی اسے کہا جاتا ہے جس نے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ ایمان میں دیکھا ہو۔
- صحابیت نہایت بلند مقام ہے، صحابہ لسانِ نبوت ہیں۔ زبان ہی مافی الضمیر کے لئے آلۂ اظہار ہے لہذا صرف صحابہ کے ذریعے ہی تعلیم نبوت، برکاتِ نبوت، اور حقائق نبوت سے باقی مخلوق آشنا ہو سکتی ہے۔
- یہ مقام حاصل کرنے کے لئے تاریخ کا ایک مختصر سا دور مخصوص کر دیا گیا۔ اس کے بعد کسی کے لئے یہ مقام حاصل کرنا ممکن نہیں۔
- محدثین اور علماءِ ربانی کے نزدیک جانبین میں سے کسی طرف سے یہ معاملہ ہونا کافی ہے یعنی کسی نے حالت ایمان میں حضور اکرمؐ کو دیکھ لیا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو دیکھ لیا تو وہ صحابی ہوگا اسی بناپر نابینا صحابی کو بھی صحابی کہا جاتا ہے۔
- صحابی ہونے کی ایک اور شرطیہ ہے کہ یہ دیکھنا حالت بیداری میں ہو۔ اگر کسی نے خواب میں حضورؐ کی زیارت کی یا آپ سے گفتگو ہوئی تو وہ صحابی نہیں ہوگا۔
- ایک اور شرطیہ ہے دیکھنے والا مومن اور حضور اکرمؐ دونوں دارِ دنیا میں ہوں۔ مثلاً حضورؐ برزخ میں تشریف لے گئے۔ جسم اطہر کو ابھی دفن نہیں کیا گیا تو کسی مومن نے آپ کی زیارت کر لی تو وہ صحابی نہ ہوگا کیونکہ اختلافِ دارین ہے
- حالتِ خواب کی طرح کشف کی صورت میں کسی کو حضور اکرمؐ کی زیارت ہو جائے، گفتگو ہو جائے تو ایسا شخص بھی صحابی نہیں ہوگا۔ کیونکہ مادی آنکھوں سے دیکھنا شرط ہے اور دونوں کا دار دنیا میں ہونا شرط ہے۔ کشف کی صورت میں ایک مادی آنکھوں سے یہ زیارت نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ دیکھنے والا اس دنیا میں ہے اور حضور اکرمؐ عالم برزخ میں ہیں۔

- بعض نے صحابی ہونے کے لئے مکلف ہونے کی شرط بھی لگائی ہے خواہ مکلف بالقوۃ ہو یا مکلف بالفعل ہو۔
- صحابہ میں فرق مراتب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ارشاد وکلاً وعد اللہ الحسنیٰ کے مطابق جنتی سب کے سب ہیں۔
- کسی عارف باللہ نے کشف کے ذریعے حضور اکرمؐ سے بات چیت کی۔ تو حضور اکرمؐ کے ایسے ارشاد حدیث نہیں کہلائیں گے
- حدیث رسول دلائل شرعی میں سے ہے اور کشف والہام محض اسرار و رموز بیان کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔
- حدیث رسول کا موضوع ذاتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے بحیثیت نبی و رسول کے، پس حدیث وہ بات ہے جس کی نسبت یا اضافت حضور اکرمؐ کی طرف کر دی جائے۔ مثلاً قولِ رسول، فعلِ رسولؐ، تقریرِ رسولؐ، ارادہ رسولؐ، صفاتِ رسولؐ یہ سب باتیں حدیث کہلاتی ہیں۔
- حدیث کو جانچنے کے دو طریقے ہیں روایت اور درایت، ہم درایت میں امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں مگر روایت میں محدثین کے مقلد ہیں۔
- ارباب تصوف وسلوک کو جب مراقبہ فنا فی الرسول حاصل ہو جاتا ہے، تو ان میں دو طرح کے صوفی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو حضور اکرمؐ کی زیارت ہو جاتی ہے دوسرے وہ جن کو مشاہدہ نہیں ہوتا مگر حضور اکرمؐ اس کو دیکھتے ہیں دونوں کے مراقبہ فنائی الرسول میں کوئی برتری یا کوئی نقص نہیں ہوتا۔
- کشف، ثمرۂ اعمال صالحہ ہے۔ صوفیا کے نزدیک وہ بہتر ہے جس کو کشف نہیں ہوتا کہ اس کے اعمال صالحہ کا ثمرہ آخرت کے لئے ذخیرہ ہو رہا ہے۔ دوسرے کو اسی دنیا میں ثمرہ مل گیا۔ والآخرۃ خیر وابقیٰ
- تصوف رضائے الٰہی کا نام ہے۔ دیکھنے دکھانے کو مقصود بنانا دراصل غیر اللہ کو مقصود بنانا ہے اصل نعمت درجۂ احسان کا حاصل ہونا ہے۔
- صحابی سارے کے سارے عادل ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے الصحابۃ کلھم عدول محدثین جب حدیث کے راویوں پر جرح کرتے ہیں تو ہر راوی کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں۔ مگر جب صحابی کی ذات آتی ہے ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور قلم رک جاتے ہیں کیونکہ حضور اکرمؐ کا فیصلہ الصحابۃ کلھم عدول کے بعد صحابہ پر جرح کرنے کی کون مسلمان جرأت کر سکتا ہے۔
- صحابی کا قول دوسرے صحابی پر حجت نہیں ہو سکتا مگر ہمارے لئے سب واجب الاتباع ہیں ارشاد نبوی ہے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم یعنی میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں تم جس کے پیچھے بھی چلو گے ہدایت پاؤ گے۔
- صحابہ لسان نبی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کی زبان پر جھوٹ کب جاری ہو سکتا ہے۔
- صحابہ کی محبت جزوِ اسلام ہے۔

(معارف القرآن)

ھدایت
اور
صراطِ مستقیم

سورۂ فاتحہ میں ہدایت کے لیے جو دعاء تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عامۂ مومنین ہیں اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لیئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں - پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعا مانگنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم ہونے پر موقوف اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

ہدایت کے اصلی معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا - اور ہدایت حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالےٰ ہی کا فعل ہے جس کے مختلف درجات ہیں۔

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے جو کائنات اور مخلوقات کی تمام اقسام، نباتات، جمادات اور حیوانات وغیرہ شامل ہیں۔

یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان اور بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام! کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی یہ دوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے

اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے ان کو بے جان اور بے شعور سمجھا جاتا ہے - احکام الٰہیہ میں بھی ان کے ضعف شعور کا اتنا اثر تو نمایاں ہیں مگر عقل و شعور نمایاں نہیں ان کو ذی حیات جاندار، مگر بے عقل و شعور کہا جاتا ہے اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں ان کو ذوی العقول کہا جاتا ہے اسی اختلاف کی وجہ سے تمام کائنات میں احکام شرعیہ کا مکلف صرف انسان اور جنات کو قرار دیا گیا ہے کہ ان میں عقل و شعور مکمل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری مخلوق میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں ارشاد ربانی ہے وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ؕ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کے بیان کو سمجھتے نہیں ہو۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا بیان کرنا اس کی معرفت پر موقوف ہے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے اور یہ علم عقل و شعور کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لیئے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر روح و حیات بھی ہے

ادراک واحساس بھی اور عقل وشعور بھی۔ مگر بعض چیزوں میں یہ جوہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے۔

ہدایت الٰہی کا یہ درجہ ادنیٰ تمام مخلوقات جمادات نباتات حیوانات انسان اور جنات کو شامل ہے اس ہدایت عامہ کا ذکر اعطیٰ کل شیئٍ خلقہٗ ثم ھدیٰ میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی۔

اسی ہدایت عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہی ہے جو چیز جس کام کے لئے بنا دی ہے۔ وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ بلکہ اس کے ادراک کا فریضہ اللہ تعالےٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے وہی زبان کی بات کو سن لیتے ہیں اور ادراک کرتے ہیں۔ بلکہ یہی حال سب اعضاء کا ہے۔

دوسرا درجہ ہدایت کا اس پہلے درجے کے مقابلے میں خاص ہے۔ یعنی ان چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے جو عرف عام میں ذوی العقول کہلاتی ہیں یعنی انسان اور جن۔ یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ پہنچتی ہے پھر کوئی اسے قبول کر کے مومن و مسلم ہو جاتا ہے اور کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مومنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہدایت اللہ تعالےٰ کی طرف سے بلاواسطہ انسان پر نازل ہوتی ہے اس ہدایت کا نام توفیق ہے۔ یعنی ایسے حالات اور اسباب پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایت کا قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے اور ان کی خلاف ورزی دشوار ہو جائے اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجہ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی اور رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتی ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے اور اس کے مزید درجات عالیہ حاصل کرنے سے کوئی بڑے سے بڑا انسان مستغنی بھی نہیں اس لئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا ہے جو ایک ادنیٰ مومن کے لئے بھی مناسب حال ہے اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتح مکہ کے ثمرات بتلاتے ہوئے ارشاد ہوا کہ ویھدیک صراطا مستقیما۔ یعنی مکہ مکرمہ اس لئے آپ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا کہ آپ کو صراط مستقیم کی ہدایت ہو۔ ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہدایت کے مجسم تھے پھر اس موقع پر آپؐ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہدایت کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا

ہدایت کی اس تشریح سے فہم قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔

اوّل :۔ قرآن کریم میں کہیں تو ہدایت کو ہر مومن و کافر کے لیئے بلکہ کل مخلوقات کے لیئے عام فرمایا گیا ہے اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا ہے جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہو سکتا ہے۔ ہدایت کے خاص و عام درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے اور دوسرا درجہ مخصوص ہے

دوئم :۔ یہ کہ قرآن کریم میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ ظالموں اور فاسقوں کو ہدایت نہیں فرماتے دوسری طرف یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہدایت عامہ سب کو کی جاتی ہے۔ اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین اور فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

سوئم :۔ یہ کہ ہدایت کے تین درجات میں پہلا اور تیسرا درجہ بلاواسطہ حق تعالےٰ کا فعل ہے اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار قرار دیا ہے وہ اسی دوسرے درجے کے اعتبار سے ہے اور جہاں یہ ارشاد ہے انک لا تھدی من احببت یعنی آپؐ ہدایت نہیں کر سکتے جس کو آپ چاہیں تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے یعنی توفیق دینا آپؐ کا کام نہیں۔

صراط مستقیم کونسا ہے؟ سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو۔ افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنا۔ پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اس صراط مستقیم کی نشاندہی کی گئی ہے جس کی دعا اس آیت میں سکھائی گئی ہے ارشاد ہے صراط الذین انعمت علیھم اس میں مثبت اور ایجابی طریق سے صراط مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات (انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین) جس راستے پر چلیں وہ صراط مستقیم ہے۔

پھر سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی کہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراض نفسانی کے تابع بدعمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے بلکہ ان کے درمیان کا راستہ چاہتے ہیں جس میں افراط ہے نہ تفریط، جو شہوات اور اغراض نفسانی کے اتباع سے اور شبہات اور عقائد فاسدہ سے پاک ہے۔

صراط مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوام عالم تباہ ہوتی ہیں ورنہ خدا طلبی اور اس کے لیئے مجاہدات کی تو کفار میں بھی کمی نہیں اسی لیئے قرآن نے صراط مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی، مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان فرمایا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے وہ یہ ہے کہ صراط مستقیم کی تعیین کے لیئے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ صراط الرسول یا صراط القرآن فرما دیا جاتا جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی۔ کیونکہ پورا قرآن دراصل صراط مستقیم کی تشریح ہے اور پوری تعلیمات رسول ؐ اسی کی تفصیل لیکن قرآن کی اس مختصر سورۃ میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراط مستقیم کی تعیین کے لیئے اللہ تعالےٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراط مستقیم کو متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو

ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو۔ قرآن کریم نے اس جگہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو کیونکہ محض کتاب اللہ انسانی تربیت کے لیئے کافی نہیں اور نہ یہ فرمایا کہ رسول کا راستہ اختیار کرو کیونکہ رسول کریمؐ کی بقا اس دنیا میں دائمی نہیں اور آپؐ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں اس لیئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے ان میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات شامل کر دئیے گئے جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے یعنی صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لیئے حق تعالےٰ نے کچھ رجال یعنی انسانوں کا پتہ دیا کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ایک حدیث میں حق پر قائم رہنے والی جماعت کا پتہ دیتے ہوئے بھی حضور اکرمؐ نے کچھ رجال اللہ ہی کا پتہ دیا۔ کہ ما انا علیہ واصحابی اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی بلکہ ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر ہوتی ہے یعنی درحقیقت انسان کا معلّم اور مربی انسان ہی ہو سکتا ہے محض کتاب معلّم اور مربی نہیں ہو سکتی ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی ۔ آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دنیا کے تمام کاروبار میں شاہدہ میں آتی ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینیئری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینیئر بن سکتا ہے اسی طرح قرآن و حدیث کا محض کتابی مطالعہ انسان کی اخلاقی تربیت اور عملی تعلیم کے لیئے ہرگز کافی نہیں۔ جب تک کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے قرآن و حدیث کے معاملہ میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمہ یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے۔

اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ کتاب کے ساتھ رسول کو معلم کتاب بنا کر بھیجنا اور صراطِ مستقیم کو متعین کرنے کے لیئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس امر کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ، تعلیم و تربیت کے لیئے کافی نہیں بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے ورنہ

؎ لاکھ چھپائیں وہ مذہبی باتیں
فرق ہے شیخی و کلرکی میں

معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح و صلاح کے لیئے دو چیزیں ضروری ہیں ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق احکام موجود ہیں دوسرے رجال اللہ یعنی اللہ والے ان سے استفادہ کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصولوں پر رجال اللہ کو پرکھا جائے جو اس معیار پر پورا اتریں انہیں رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے اور جب رجال اللہ صحیح معنوں میں حاصل ہو جائیں تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا بڑا سبب یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لیا اور رجال اللہ سے قطع نظر کر لی اور ان کی تفسیر و تعلیم کو کوئی اہمیت نہ دی۔

اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیار حق سمجھ لیا اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لی اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

امثالِ عرب اور قرآن و حدیث

مولانا عبد الحفیظ رحمانی

جادو بیانی! مثال :- اِنَّ من البیان لسحراً

"یقیناً بعضے بیان جادو ہوتے ہیں"۔

ماخذ : عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قدم رجلان من المشرق فخطبا فعجب الناس لبیانھما فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من البیان لسحراً (الحدیث بخاری)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمی مشرق کی جانب سے آئے، انہوں نے خطاب کیا تو لوگ ان کے بیان سے سخت متعجب ہوئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یقیناً بعضے بیان جادو ہوتے ہیں"

خطابت اور شعر گوئی یہ دو انسانی اوصاف ہیں جو انسانی قلوب کو آن کی آن میں مسحور کر لیتے ہیں انسان کچھ ایسا سرشار ہو جاتا ہے کہ خطیب و شاعر کے تمام احوال سے صرف نظر کر لیتا ہے پھر یہ جادو بیانی زبان زدِ عوام قوم پر اثر انداز ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خطابت کو "انقلاب آفریں" کہا جاتا ہے

ابھی معرکۂ آزادی کو کتنے دن ہوئے یاد ہوگا کہ قلب و جگر کو متحرک کرنے والے، آزادی کا نشہ پلانے والے خطباء ہی تھے۔ جنہوں نے آزادی کا صور پھونکا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحمہم اللہ کے انقلاب آفریں خطاب سے ہمارے کان آشنا ہیں۔

پھر خطاب صرف تحریک ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ انداز فکر اور نظریات کو بھی بدل دیتا ہے شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ جادو بیان خطیب کا ایک خطاب اختلاف کی خلیج کو پُر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غور و فکر کے بعد تھوڑا بہت اختلاف پھر پیدا ہو جاتا ہے لیکن خطاب کے دوران تو جادو چل ہی جاتا ہے جیسا کہ مشرقی خطیبوں نے اپنے خطاب سے محوِ حیرت بنا دیا تھا، تو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حیرت و استعجاب کو مذکورہ ارشاد سے دور فرمایا شرم و حیا ! ۔

مثال: اذا لم تستحی فاصنع ما شئت

"جب شرم نہ رہے تو جو چاہے کرو"

ماخذ: عن ابن مسعودؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولیٰ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت

(بخاری مشکوٰۃ)

"ابن مسعودؓ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگلے انبیاءؑ کے جو ارشادات لوگوں نے پائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب شرم نہ رہ جائے جو چاہے کرو"

شرم وحیا انسانوں کا فطری تقاضا ہی نہیں بلکہ ایمان کا ایک جزو بھی ہے چنانچہ بصراحت ارشاد نبوت ہے

الایمان بضع وسبعون شعبۃ فافضلها قول لا الٰہ الا اللہ وادناها اماطۃ الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان

(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

"ایمان کے ستر سے اوپر کچھ شعبے ہیں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ ہے اور ادنیٰ شعبہ راستہ کو تکلیف دہ چیزوں سے صاف رکھنا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت درجہ حیادار تھے کہ ابو سعید خدریؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت حیاء کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ:۔

کان اشد حیاء من العذراء فی خدرها

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نقاب والی دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے تھے۔"

کیونکہ بے حیائی چند در چند بداخلاقیوں کا فتح باب کرتی ہے پس حیاء کو جزو ایمان قرار دے کر بے حیائی کا سد باب کر دیا گیا ہے باایں ہمہ جو لوگ بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں انسان نما حیوان ہیں کہ بے حیائی حیوانیت کا خاصہ ہے

رحم وکرم **امثال:**۔

ارحم من دونک یرحمک من فوقک

"جو تم سے پست ہے اس پر رحم کرو جو تم سے بلند ہے وہ تم پر رحم کرے۔"

ماخذ:۔ عن عبداللہ بن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراحمون یرحمهم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء

(ابوداؤد ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

"ابن عمروؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتے ہیں تم اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

رحم وکرم معاشرہ کا ایسا جزو ہے کہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص شاہ ہو کر گدا، امیر ہو کر غریب فقیر ہو کر تنگ دست اپنی جگہ پر رحم وکرم کا محتاج ہے، مادۂ رحم کسی میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ رحمٰن سے جو جتنا زیادہ قریب ہے اسی قدر اس میں رحم بھی زیادہ ہے کیونکہ رحم بھی رحمت خداوندی ہے اور بے رحمی بدبختی وشقاوت ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

لا تنزع الرحمۃ الا من شقی (مشکوٰۃ)

"رحم بدبخت ہی سے سلب کیا جاتا ہے۔"

پھر یہ بھی ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ رحم کرتا ہے۔ وہ
مستحق ہوتا ہے اور رحم کیا جاتا ہے اس کے برعکس ظالم پر
ظلم اور سخت گیری سے سخت گیری ہوتی ہے دنیا میں بھی اور
آخرت میں بھی۔ ارشاد نبوت ہے:۔

من لا یرحم لا یرحم (بخاری)

"جو شخص رحم نہیں کرتا ہے اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا"

نیکی اور بدی:۔

مثال:۔ اتبع السیئة الحسنة تمحہا

"برائی کے بعد نیکی برائی کو مٹا دیتی ہے"

ماخذ:۔ عن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتق اللہ حیث ماکنت واتبع السیئة الحسنة تمحہا وخالق الناس بخلق حسن

(احمد، ترمذی، دارمی)

"حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں بھی اللہ سے ڈرو اور برائی کے (ارتکاب) کے بعد نیکی برائی کو مٹا دیتی ہے، لوگوں سے حسنِ خلق سے ملو۔"

برائی کے بعد عمل نیک سے طبیعت میں گداز اور قبولِ حق کی استعداد پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ ایک خاص احساس برائیوں کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے، قلب مائل بہ اتقاء ہوتا ہے اسی لئے قرآن نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ:۔

انّ الحسنات یذھبن السیئات (ھود)

"یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں"

سورۂ عنکبوت میں نماز کے باب میں اسی اعلان کو اس طرح دہرایا گیا ہے کہ:۔

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت)

"نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے"

حقیقت ہے کہ اگر عمل شر کے بعد عملِ خیر احساس و تاثر سے کیا جائے تو یہی عمل توبہ و انابت بن جاتا ہے اور توبہ و انابت کی حقیقت معلوم!

حق و باطل:۔

مثال:۔ اوھن من بیت العنکبوت

"مکڑی کے جالے سے بھی کمزور"

ماخذ:۔ مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون

(سورہ عنکبوت)

"ان لوگوں کی مثال جو خدا کے علاوہ دوست بناتے ہیں مکڑی کے جالے جیسی ہے کہ وہ گھر بنا لیتی ہے اور حقیقت ہے کہ تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہوتا ہے کاش کہ وہ جانتے۔"

جس طرح حق ناقابلِ شکست اور باطل شکست پذیر ہوتا ہے۔ ایک "ولی حق" ناقابلِ شکست اور "ولی باطل" شکست پذیر ہوتا ہے۔ ایک خدا دوست غیر متزلزل ہوتا ہے، حوادث و آلام، موج و طوفان اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کر سکتے اس کے برعکس دوئی پسند کا استحکام مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کے لئے بس ہے۔

رزمِ حق و باطل میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا

کر دوئی پسندوں کا گروہ "خیفیت" کے مقابلہ میں کتنی دیر ٹھہر سکا ہے۔

اخوتِ عامہ!

مثال:۔ انصر اخاک ظالماً او مظلوماً

"اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم"

ماخذ:۔ عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصر اخاک ظالماً او مظلوماً فقال رجل یا رسول اللہ انصرہ مظلوماً فکیف انصرہ ظالماً قال تمنعہ من الظلم فذالک نصرک ایاہ (احیاء العلوم، مشکوٰۃ)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو اس کی مدد کروں گا کہ یہ مظلوم ہے اور ظالم کی مدد کس طرح کروں؟ فرمایا ظالم کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے"

رحم و کرم کے سلسلہ میں آپ نے محسوس کیا ہے ہر شخص اس کا محتاج ہے اسی کو اسلام مختلف و متعدد عنادین سے پیش کرتا ہے۔ ترحم، اعانت و امداد کا ایک باب ہے کیونکہ اسلام طوفان خیز "دو نرم سیر" دیکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے جب ہر شخص رحم و کرم، اعانت و امداد کے جذبے سے سرشار ہوگا تو ہنگامہ کا باب ہی مسدود ہو جائے گا، البتہ اعانت و ترحم کی حیثیات جداگانہ ہیں قدر مشترک ایک ہے ظالم کو ظلم سے باز رکھنا، مظلوم کی دستگیری کرنا، امیر کا انتظام حکومت میں ہاتھ بٹانا۔ فقیر کی حاجت روائی کرنا پریشان کی پریشانی دور کرنا یہ سب ترحم و اعانت میں شامل ہیں۔ چنانچہ اس "رحمت" کے عوض میں رحمتِ خداوندی کی بشارت ہے۔

من فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیامۃ (الحدیث مختصراً)

"جو شخص کسی مسلمان کی پریشانی کو دور کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کی پریشانیوں میں سے اس کی کوئی پریشانی دور فرما دیں گے۔"

کیا یہ اخلاقی تعلیم، یہ مروت و ایثار کا سبق ہر انسان میں رواداری کی روح کو بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

موت و حیات!

مثال: انک میت و انہم میتون

"بے شک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں"

ماخذ:۔ انک میت و انہم میتون ط ثم انکم یوم القیامۃ عند ربکم تختصمون ط (زمر)

"بے شک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں، پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس جھگڑو گے۔"

موت و حیات ایسی کھلی ہوئی تجربی چیز ہے کہ اس کو سمجھانے کی چنداں ضرورت نہیں کون نہیں جانتا کہ موت و حیات کا سلسلہ ہمہ وقت اور ہر شخص کے ساتھ ہے کتنے جاندار روز مرتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں قرآن حکیم اسی سلسلے کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ موت سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے، پیغمبر ہو کہ ولی، صالح ہو کہ فاجر، ہر ایک کو موت کا

پیالہ پینا ہے۔ اگر کوئی ذات اس سے مبرّا ہے تو صرف خدا کی ذات ہے۔

پھر اس موت کے بعد ایک اور حیات ہے اس حیات کے ساتھ ہی حاکم مطلق کے حضور پیشی ہوگی۔ وہاں حقدار غاصب سے اپنا حق طلب کرے گا۔ مظلوم ظالم سے جھگڑے گا تاآنکہ حاکم مطلق کے حکم سے غاصب و ظالم کے تمام اعمال حقدار و مظلوم کو سونپ دیئے جائیں گے اور ان کی بدیاں ان کے سر منڈھ دی جائیں گی، یہی معاملہ ہر شخص کے ساتھ ہوگا جس نے حقوق تلفی وغیرہ کی ہوگی حتیٰ کہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کے باوجود ایسے اشخاص مفلس ہوں گے، اس لئے موت و حیات کا مرحلہ ہر وقت پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اللہ تعالےٰ ہم سب کو آخرت کی رسوائی سے بچائیں۔

فتنہ انگیزی!

مثال:۔ الفتنۃ اشد من القتل

"فتنہ قتل سے بھی سخت ہے"

ماخذ:۔ اقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل (البقرۃ)

"اور ان کو جہاں بھی پاؤ قتل کرو اور ان کو نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

یہاں اس آیت پاک کی تفسیر مدنظر نہیں بلکہ صرف مثال کی تفہیم ہے فتنہ کیا ہے؟ نظام میں اختلاف کی کوشش، خواہ انتظامیہ دین سے متعلق ہو یا عدالت سے۔ بہرحال شرارت کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تخریب ہو، نظام معطل ہو جائے اور لوگ آپس میں لڑ جائیں چونکہ فتنہ محدود نہیں متعدی ہوتا ہے اور اس درجہ کہ اندرونی طور پر ایک دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے پس پردہ اپنے حلیف کا ہی رشتہ منقطع کرنا چاہتا ہے اور پھر یہی فتنہ اور دراندازی افراد سے گزر کر خاندان اور یہاں سے قوم تک پہنچتی ہے اور سخت ترین ٹکراؤ ہوتا ہے جو قتل سے کہیں زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوتا ہے اس لئے فتنہ کو قتل سے زیادہ سنگین بتایا گیا

امتحان و آزمائش:۔

مثال:۔ ان ھی الا فتنتک

"صرف یہ تیری آزمائش ہے"

ماخذ: اتھلکنا بما فعل السفھاء منا ان ھی الا فتنتک تضل بھا من تشاء و تھدی من تشاء (اعراف)

"کیا آپ چند بے وقوفوں کی حرکت پر ہم سب کو ہلاک کر دیں گے یہ واقعہ محض آپ کی طرف سے آزمائش ہے ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہ کر دیں اور جس کو چاہیں ہدایت دیں۔"

آزمائش و امتحان سنتِ الٰہی ہے جس کو ذات خداوندی سے جس قدر تقرب ہوتا ہے اسی قدر ابتلا ہوتا ہے اور مقربینِ بارگاہ کو اس آزمائش و امتحان کا ادراک و احساس بھی ہو جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ سب سے زیادہ ذاتِ اقدس سے قریب ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کا سخت ترین امتحان بھی ہوتا ہے

اس کے متحمل بھی صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہم السلام کی آزمائش ہوئی کہ آپ ستر افراد کو منتخب فرما کر طور پر لے گئے وہاں انہوں نے کلام خداوندی کو سنا تو کہنے لگے ہمیں تو تجلی ذات کے بغیر یقین نہیں آسکتا۔ دفعتاً بجلی کی ایک کڑک نے سطح خاک پر بچھا دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس آزمائش کا احساس ہوا تو پکار اٹھے ان ھی الا فتنتک

بقیہ تصوف اور تعمیر سیرت

مرچکا ہو یا مخبوط الحواس ہو کر پھر بھی گناہ یا جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو چکا ہوگا کہ سالک جب یہ مراقبہ کرے تو اس کے اندر اور اس کے اعمال میں کیا تبدیلی آجانی چاہئے۔ اس طریقہ سے وہ خود معلوم کرے گا کہ قرب الہٰی کی طرف میں کتنے قدم بڑھا ہوں۔

میرا یہ مقام پختہ ہوا ہے یا نہیں کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کہ ذرا اپنی بصیرت سے یہ دیکھ کر ناپیں کہ میری روح کی پرواز کہاں تک ہے وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکے گا کہ ذکر کی برکت سے شیخ کی توجہ سے جو سٹیم میرے باطن میں بھری گئی ہے اس نے عملی زندگی کے انجن کو منزل کی طرف چلایا ہے یا نہیں اگر انجن چل پڑا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اس رفتار کو قائم رکھنے کی کوشش کرے اور اگر ابھی تک یہ حقیقت صرف ایک علم یا ایک فلسفہ کی حد تک ہی محدود ہے تو کوشش کرے یہ حال بن جائے اور اس کی عملی زندگی کی ہر حرکت یہ ظاہر کرے کہ اسے اللہ کے حاضر ناظر ہونے اور اس کی معیت کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔ (باقی باقی)

ماہنامہ **المرشد** چکوال (جہلم)

جس میں دینی اخلاقی، علمی، ادبی، روحانی اور اصلاحی مضامین چھپتے ہیں اور

اہل دل نے اہل قلم کے روپ میں دنیوی اور اخروی مسائل کے حل پیش کرنے شروع کئے ہیں

اس رسالہ کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ الحسنات منزل - چکوال (جہلم)

سٹاکسٹ: مدنی کتب خانہ گنپت روڈ - لاہور

تصوّف

اور تعمیر سیرت

پروفیسر حافظ عبدالرزاق ایم۔ اے

مجلس ذکر:۔

تصوف وسلوک کی تعلیم وتربیت کے بنیادی اسباق یعنی لطائف کا تفصیلی بیان ہو چکا اور یہ واضح ہو چکا کہ لطائف کے منور ہونے یا جاری ہونے یا راسخ ہونے سے سالک کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے قلب کو تعلق مع اللہ پیدا ہونے سے اور اس کے اندر اتباع سنت کا جذبہ کامل پیدا ہونے سے اس کے شخصی حالات اس کے اخلاق اور معاشرے میں رہ کر دوسروں سے اس کے معاملات پر کیا اثر پڑتا ہے

اس کا نصب العین آخرت کی فوز وفلاح بن جاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے دنیا اور سامان دنیا جو ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی قدر وقیمت اس پر واضح ہو جاتی ہے اس کے اندر مخلوق کی خیر خواہی کا جذبہ اس حد تک پیدا ہو جاتا ہے کہ مخلوق کو ایذا دینا تو ایک طرف مخلوق کے ایذا کے تصور سے بھی اس کی روح کانپتی ہے، لہٰذا اس تفصیل سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سماجی برائیوں کے قلع قمع کے لئے جو احساس پیدا ہو رہا ہے جو تحریکیں چل رہی ہیں اور (ERADICATION OF SOCIAL EVILS) کے نام سے محکمے کھڑے کر کے جو قوت اور مال کی قربانی کی جا رہی ہے اگر اس کی جگہ اُمتِ مسلمہ کے افراد کو تصوف وسلوک میں تربیت دے کر یہ لطائف ہی کرا دیئے جائیں تو تمام سماجی برائیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے اور انسانیت کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہو سکتا ہے۔

لطائف کے بعد مراقبات کی تربیت کی جاتی ہے اور مراقبات ثلاثہ یکے بعد دیگرے کرائے جاتے ہیں۔

مراقبہ کے لفظی معنی انتظار، نگہبانی اور حفاظت کے ہیں یعنی سالک پورے حضور قلب سے اس بات کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت، رحمت، فیض اور انوار اس کے قلب میں جاگزیں ہونے لگیں اس کے لئے (RECEIPTIVE ATTITUDE) ہونا لازمی ہے

تاکہ اس کا قلب منبع ہدایت اپنی ذات کے لئے اور دوسروں کے لئے بن جائے اور اللہ کی رحمت سے اس کا وجود اور اس کی ذات مخلوق کے لئے رحمت بن جائے اور توفیق الٰہی سے فیض یزدانی اور انوار رحمانی اس کے ظاہر و باطن کو سنوار دیں۔

نگہبانی اس بات کی کہ کوئی جذبہ اور خیال اس کی توجہ کو اللہ کی طرف سے نہ ہٹا سکے اور حفاظت اس دولت کی جو لطائف کی صورت میں حاصل ہو چکی ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی نگہداشت اور حفاظت

ہونے لگتی ہے وہ شیاطین الانس والجن سے اس کی حفاظت فرماتا ہے۔

اصلاحِ تصوف میں مراقبہ کی حقیقت مولانا تھانویؒ کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"کسی مضمون کا دل سے اکثر احوال میں یا ایک محدود وقت تک اس غرض سے کہ اس کے غلبہ سے اس کے مقتضی پر عمل ہونے لگے ۔ تصور رکھنا مراقبہ کہلاتا ہے جو اعمال مقصودہ قلب میں سے ہے ۔"

اس حدیث میں اس کا امر ہے:

عن ابن عمر قال اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنکبی وقال کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل اخرجہ البخاری والترمذی فزاد وعد نفسک من اھل القبور

یعنی ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ؐ نے میرا کندھا پکڑ کر ارشاد فرمایا ۔ دنیا میں اس طرح رہ گویا تو مسافر ہے بلکہ گویا راہ میں گزر رہا ہے ۔ اور اپنے کو اہل قبور میں شمار کر۔

" اہل قبور میں اپنے آپ کو شمار کرنا عمل قلب ہے اور اس پر اثر جو مرتب ہوتا ہے وہ محبت دنیا کو کم کر دیتا ہے اور اتقیا و تفویض کا غالب ہو جانا ہے"

التکشف میں ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

" ذات و صفات حق تعالیٰ یا کسی مضمون خاص کی طرف تدبر تام سے متوجہ ہونا اور اس کا تصور قلب میں مواظبت کے ساتھ جمانا مراقبہ کہلاتا ہے "

یہ حقیقت ایک حدیث سے مستفاد ہوتی ہے

عن ابن عباس قال قال ابوبکر یا رسول اللہ قد شبت قال شیبتنی ھود والواقعۃ اخرجہ الترمذی

یعنی حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ تو بوڑھے ہو گئے فرمایا مجھے سورۂ ھود اور سورۃ واقعہ نے بوڑھا کر دیا۔"

"ظاہر ہے کہ یہ اثر خشیت کا کہ جوان سے بوڑھا کر دے موقوف ہے تفکر دائم اور توجہ قوی پر پس حدیث سے عمل مراقبہ کا اثبات ظاہر ہوتا ہے"

مراقبہ کی اصطلاح کی حقیقت معلوم کر لینے کے بعد ہم اپنے پہلے سبق یعنی "مراقبہ احدیت" کی طرف آتے ہیں ۔ اس مراقبہ کے وقت اور اس کے دوران زبان قلب یا زبان ظاہر سے چند الفاظ کہے جاتے ہیں

پہیا۔ "بےنیاز اللہ" یعنی اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے فیض کے آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا ہوں مگر ہر لین دین میں دونوں طرف کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے اور دونوں طرف کسی قسم کی احتیاج پائی جاتی ہے تو سالک کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے مگر کیا دینے والے کو بھی کوئی احتیاج ہے تو دوسرا لفظ "منزہ" یعنی وہ تو ہر قسم کی احتیاج ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے مگر وہ دینے والا ہے کون؟ ذرا دیکھ تو لوں۔ تو تیسرا لفظ ہوتا ہے "بے چون وچگون" یعنی تم اسے کیا دیکھو گے وہ تو ایسی ذات ہے کہ اس کی کوئی مثال بھی تصور میں نہیں آسکتی اس لئے پیکر تراشی کا خیال بھی نہ کرو۔ درست اگر جب وہ ایسا ہے تو میرا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے پھر الفاظ آتے ہیں "وَاِلٰـهُكُمْ" کہ وہ معبود ہے اور تو عبد ہے اور معبود اس لئے ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ہے اور تیرا معبود نہیں سب کا معبود ہے مگر دیکھنا انسان عبادت کے رشتے جوڑنے میں دھوکا بھی کھا جاتا ہے اس لئے کہا اللہ واحد کہ معبود صرف وہی اور کوئی معبود نہیں جب یہ بات سمجھ چکے کہ صرف وہی ایک معبود ہے تو کہو وحدہٗ، اب تک تم غائبانہ باتیں کرتے رہے اب تم اپنے معبود کو مخاطب کرکے براہ راست اس سے کلام کرو۔

کانک تراہ

جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور کہو لا شریک لک یا اللہ کہ اے میرے اللہ تیرا کوئی شریک نہیں۔ یہاں تم نے لا شریک لک فی العبادۃ نہیں کہا بلکہ مطلق لا شریک لک کہا تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ عبادت میں کوئی تیرا شریک نہیں تخلیق کائنات میں تو لا شریک ہے تو رزق کائنات میں کوئی تیرا ساجھی نہیں تدبیر کائنات میں کسی کے مشورے کا محتاج نہیں

اب اس تصور میں گم ہو جاؤ تاکہ اس کے مقتضی پر عمل ہونے لگے اس کا مقتضی کیا ہے؟ یہی کہ میری عملی زندگی میں عبادت صرف تیری ہوگی یعنی میں صرف تیری بات مانوں گا یا اس کی بات مانوں گا جو تیری بات کہے۔ کیونکہ بات تو تیری ہوگی وہ تو صرف پہنچانے والا ہوگا پہنچانے والے کا شکرگزار ہوں گا کیونکہ اس نے تیری بات پہنچائی اور مجھ نالائق کو پہنچائی اس کا احسان مانوں گا۔

پھر تخلیق میں جب تو لاشریک ہے تو جسے چاہے پیدا کرے کون اس میں دخل دینے والا ہے تو نے بتا دیا۔

یخلق ما یشاء یھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء الذکور او یزوجھم ذکرانا واناثا ویجعل من یشاء عقیماً۔

"یعنی تو جو چاہے دیتا ہے چاہے بچی دے چاہے کسی کو بچہ دے چاہے جڑواں دیدے چاہے کسی کو بانجھ کر دے جب تخلیق میں تیرا کوئی شریک نہیں تو اس پہلو پر تیرا جو فیصلہ ہو میں اس پر راضی ہوں خوش ہوں مطمئن ہوں پھر جب رزق دینا تیرا ہی کام ہے اور تیرا اعلان ہے

یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر

چاہے تو کسی کو فراوانی سے دے چاہے تو اپنے انداز کے مطابق کسی کی تمنا سے کم دے۔ تو پھر میں تیری تقسیم پہ مطمئن ہوں"

یہ اطمینان مجھے زر پرستی سے رشوت اور دھوکے سے غبن اور فریب کاری سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے میں ان میں سے نہیں ہوں گا جو یہ کہنے لگیں۔

لیلیت لنا مثل ما اوتی قارون انه لذو حظ عظیم

" کاش مجھے بھی اتنا کچھ ملتا جو قدیم وجدید قارونوں کو تو نے دے رکھا ہے بلکہ میں تو کہوں گا۔

ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحا

یہ دولت کیا کم ہے جو تو نے مجھے اپنا بنا رکھا ہے۔

پھر اس کا مقتضی یہ ہے کہ جب میں نے تسلیم کر لیا کہ تدبیر کائنات میں تو لاشریک ہے تو میں تیرے فیصلوں پر چیں بجبیں کیوں ہونے لگا بلکہ میں تیرا شکر کروں گا کہ مجھے بلا استحقاق ملا اور دکھ میں صبر کروں گا کہ اس سے بڑی مصیبت دینے پر بھی تو قادر تھا مگر اپنی رحمت سے میری بھلائی کے لئے میری ناتوانی دیکھ کر یہ چھوٹی مصیبت دکھائی۔ میں جانتا ہوں

ما اصاب من مصیبة الا باذن اللہ ومن یومن باللہ یھد قلبه،

یعنی مصیبت اس کے حکم سے آتی ہے اور مصیبت میں دل کو ٹھکانے پر رکھنا بھی اسی کی عنایت سے ہوتا ہے۔

غم چو بینی زود استغفار کن
غم بامر خالق آید۔ کار کن

جب غم تو نے دیا تو میں اسے محبوب کا تحفہ سمجھ کر کہہ دوں گا

سہ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اجمالی طور پر اس مراقبے کا مقتضی یہ ہے کہ اس مراقبہ کے راسخ ہونے کا اثر سالک کے اعمال پر یہ ہونا چاہیئے کہ ہر حال میں زبان حال سے کہتا رہے کہ لانافع الا اللہ لاضار الا اللہ انت مقصودی ورضاک مطلوبی۔

مقصد یہ ہے کہ ذہنی عمل یہ مراقبہ رفتہ رفتہ حال بن جائے۔ کسی حقیقت کا علم ہونا اور چیز ہے اور اس حقیقت کا حال بن جانا اور بات ہے اور یہی مطلوب ہے۔

یہ دکھ اور مصیبت کا معاملہ ذرا کٹھن ہے اس میں امور طبعی کے پیش نظر کچھ ہدایتیں ہیں کچھ رعایتیں ہیں مثلاً مصیبت آئے تو اظہار رنج چار صورتوں میں ہوتا ہے اول دل میں غم کا احساس ہوتا ہے دوئم آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں یہ دونوں طبعی ہیں اور غیر اختیاری ہیں اس لئے ان پر مواخذہ نہیں اور یہ کسی درجے میں مذموم نہیں اس لئے اس صورت میں آدمی معذور تصور ہوتا ہے مگر دو صورتیں اختیاری ہیں یعنی زبان سے گلہ شکوہ۔ بین نوحہ کرنا اور ہاتھوں سے گریبان پھاڑنا۔ سینہ کوبی کرنا وغیرہ یہ دونوں اختیاری ہیں اسلئے قابل مواخذہ ہیں مذموم ہیں ناجائز ہیں اور یہ تو اللہ کے فیصلے کے خلاف احتجاج ہے بڑا ایک ہے اس لئے حضور اکرم ؐ نے نوحہ کرنے والوں اور والیوں کے لئے سخت وعید سنائی ہے کیوں نہ ہو جو بندہ ہو کر مالک کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرے خالق کے نزدیک اس سے زیادہ ناپسندیدہ کون ہو سکتا ہے۔

اس کے برعکس حضور اکرم ؐ نے ایسے حالات کے لئے ایک مراقبہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے

لاتقل لوانی فعلت کذا لکان کذا ولکن قل ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن اوکما قال ؐ

یعنی جب کوئی نامساعد حالات پیش آجائیں تو یہ نہ کہو کہ میری تدبیر غلط ہو گئی اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف تدبیر اور سبب کو مؤثر سمجھتے ہو اور مسبب اور مدبر کا خیال تک نہیں بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے جو چاہا وہ ہو گیا اور جو اس نے نہیں چاہا نہیں ہوا۔ پہلا اصول تجویز ہے دوسرا

اصول تفویض ہے اور اصول تجویز کا ماحصل پریشانی کے سوا کچھ نہیں اور اصول تفویض کا نتیجہ سراسر اطمینان اور سکون ہے

یہ ذہنی عمل اور یہ مراقبہ جب حال بن جائے تو صورت عجیب بن جاتی ہے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے لئے یہ حقیقت حال بن چکی تھی کہ مصیبت کو بھی رحمت محسوس کرتے تھے ایک دفعہ ایک بیمار تڑپتا ہوا آیا کہ حضرت دعا کریں سخت تکلیف میں ہوں شاگرد سوچ میں پڑ گئے کہ دیکھیے حضرت کیسے دعا کرتے ہیں جب ان کے نزدیک بیماری بھی رحمت ہے تو صحت کی دعا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ رحمت کے چھن جانے کی دعا کریں گے اور اگر نہیں کرتے تو ایک مصیبت زدہ کی دلجوئی کی صورت کیا ہوگی۔ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا شروع کی الٰہی! بیماری بھی رحمت ہے صحت بھی رحمت ہے ہر آدمی ہر قسم کی رحمت کا متحمل نہیں ہو سکتا یہ کمزور ہے اس کے حق میں بیماری کی رحمت کو صحت کی رحمت سے بدل دے تو قادر ہے۔

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مراقبہ احاطت کی حقیقت کو ہمارا حال بنا دے۔

مراقبہ معیت:۔

مراقبات میں یہ دوسرا سبق ہے اس مراقبہ میں یہ الفاظ اور ان کے معنی پر غور کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب میں فیوض وانوار کا انتظار کیا جاتا ہے پہلا جملہ ہے اللہ حاضری یعنی اللہ میرے سامنے موجود ہے جب اتنی بڑی اور بے نیاز ذات موجود ہے تو چھوڑ کر کسی اور طرف توجہ کیوں کروں اور کیسے کروں دوسرا جملہ ہے اللہ ناظری یعنی اللہ مجھے دیکھ رہا ہے جب وہ سامنے ہے اور مجھے دیکھ بھی رہا ہے تو اس کے سامنے میری حالت میرے ظاہر و باطن کی حالت کیسی ہونی چاہیے۔ لازماً ایسی کہ اسے ناپسند نہ ہو ہیئت ظاہری ناپسندیدہ نہ ہو، عقیدت ادب کا اظہار ہو اور باطن کی حالت یہ ہو کہ دل میں خشوع وخضوع ہو، دل میں کوئی ایسا خیال نہ آنے پائے جو اسے ناپسند ہو وہ تو علیم بذات الصدور ہے صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا میرا باطن بھی اس کے سامنے ہے تیسرا جملہ ہے اللہ معی - اللہ میرے ساتھ ہے بندے کو رب کی معیت حاصل ہو جائے تو اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا یہاں تک تو سائل کا خیال اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور ایک خاص حالت اور ایک مقام سے متعلق جہاں سالک بیٹھا ہے اس سے اس لغزش کا امکان ہے کہ وہ اور کہیں نہیں بلکہ یہیں ہے اور کسی کے ساتھ نہیں صرف میرے ساتھ ہے تو اس ٹھوکر سے بچنے کے لئے چوتھا جملہ ہوتا ہے۔

وھو معکم اینما کنتم یعنی مخلوق کہیں بھی ہے اور جس حالت میں ہے جو بھی ہے اللہ اسکے ساتھ ہے اور اس کا احساس کہیں علمی ہے کہیں عقلی ہے کہیں حالی ہے مگر ہے بلاکیف کہ اس معیت کی حقیقت بیان میں نہیں آسکتی انسان کو کسی کی معیت کا احساس دو موقعوں پر ہوتا ہے اول خوف کی حالت میں تو جب انسان کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے خواہ اپنی ذات کے لئے خطرہ کا احساس ہوا خواہ اپنے متعلقین کے لئے تو اسے کسی معاون کسی مددگار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے سالک کا یہ مراقبہ جب راسخ ہو جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ میرے ساتھ ہے میرا معاون ہے اور اس سے قوی تر معاون اور کون ہے دشمن خواہ کتنا قوی ہو آخر مخلوق ہے اور خالق کے مقابلے میں مخلوق کی حیثیت ہی کیا ہے قرآن کریم میں ایسے مواقع کی کئی مثالیں بیان ہوئی ہیں

حضرت موسیٰؑ کو اپنے بھائی کو ساتھ لے کر جب فرعون کو دعوت الی اللہ دینے کے لئے جانے کا حکم ہوا، تو آپ کو اندیشہ ہوا کہ وہ تو میری جان کا لاگو ہے سامنے ہوتے ہی مجھے قتل کرا دے گا تو اللہ کا پیغام کیسے پہنچاؤں گا۔ تو اللہ تعالےٰ نے تسلی دی اور فرمایا۔ لا تخافا۔ تم دونوں مت ڈرو تمہاری حفاظت کرنا میرا کام ہے۔

اِنَّنِیْ معکما اسمع و اریٰ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں میں تمہاری دعوت کے الفاظ سن رہا ہوں گا اور اس منظر کو خود دیکھ رہا ہوں گا پھر ڈر کیسا اس معیت باری کا یہ اثر تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے نہایت جرأت اور اطمینان سے نہ صرف دعوت کا پیغام پہنچایا بلکہ فرعون کی آنکھ سے آنکھ ملا کر خوب سوال و جواب ہوئے یعنی معیت باری کا احساس انسان کو جری بنا دیتا ہے اندیشہ ہائے دور دراز بالکل کافور ہو جاتے ہیں اور کیفیت کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ ؎

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہوا ہے کیا خوش مزاج ہے

دوسرا موقع وہ ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے حضرت ابوبکرؓ کو بحکم الٰہی ساتھ لے کر مکہ سے چلے اور غارِ ثور میں جا قیام کیا ادھر قریش بھی کھوج لگا کر غار تک پہنچ گئے۔ صدیق اکبرؓ نے دشمن کے پاؤں کی آہٹ ہی نہ سنی بلکہ وہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے ان کی باہمی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ اس متاعِ دوجہاں کو یہ ظالم کوئی گزند نہ پہنچائیں تو عرشِ الٰہی سے تسلی کے الفاظ نازل ہوئے اور جس کے متعلق خوف تھا اسی کی زبان حق ترجمان سے سنا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

تو غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ معیت باری کا مژدہ سنا تو کیفیت بدل گئی یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہ مراقبہ سالک میں ایسی سپرٹ بھر دیتا ہے کہ خطرات میں اس کے دل کی دنیا میں کوئی مدوجزر نہیں آتا آج جنگی مہموں میں اور عین جنگ میں انتہائی کوشش کی جاتی ہے کہ سپاہیوں کا مورال بلند رہے کاش کوئی سوچے کہ ایک ہزار کے مقابلے میں ۳۱۳ کا مورال بلند رکھنے والی کونسی تدبیر تھی اس کے سوا کسی اور تدبیر کا سراغ نہیں ملتا کہ انہیں یقین تھا کہ ھو معکم اینما کنتم۔

صرف یقین نہیں بلکہ یہ حقیقت ان کے لئے حال بن چکی تھی۔

کسی کی معیت کے احساس کا اہم جیسے لوگوں کے لئے ایک اور موقعہ ہوتا ہے اور وہ ہے لالچ۔ دنیا کا لالچ گناہ کی خواہش لذت پرستی کا شکار ہو جانے کا موقعہ ہے سالک کو جب معیت باری کا احساس ہو تو رشوت لیتے وقت یہ احساس اس کا ہاتھ روک لے گا برائی کا ارادہ کرتے وقت اسے شرم محسوس ہونے لگے گا کہ مالک میرے ساتھ ہے موجود ہے دیکھ رہا ہے پھر اس ڈھٹائی کی جرأت کیسے؟ اس ایک ہی مراقبہ سے نہ صرف شخصی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ تمام سماجی برائیوں کا قلع قمع بھی ہو جاتا ہے آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ گناہ یا جرم اس وقت کرتا ہے جب اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ کسی کو کوئی خبر نہیں، کوئی دیکھ نہیں رہا مگر جب اس کا یقین جم چکا ہو کہ اللہ موجود ہے دیکھ رہا ہے میرے ساتھ ہے تو اتنا جری صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے اندر کا انسان

(باقی صـــ)

قسط ۳

ابوسعید
ایم-اے

خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

(سفرِ حرمین کے تاثرات)

جبلِ نور

آج جبلِ نور دیکھنے کے لئے گھر سے چلے۔ دامنِ کوہ میں پہنچ کر حضرت معہ چند ضعفاء آرام کرنے لگے۔ باقی رفقاء پہاڑ کی اس چوٹی پر پہنچ کر وہ مقام دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے جہاں صدیوں کے بعد خدا اور بندے کے درمیان اللہ کے ایک خاص ایلچی کے ذریعے سلسلہ کلام شروع ہوا اس کلام کی ابتداء کچھ اس انداز سے ہوئی اور ایسے الفاظ میں ہوئی کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کلام آخری ہے۔ جامع ہے۔ لازوال ہے غیر فانی ہے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے ابتدا سے ایک حکم سے ہوئی۔ اقراء۔ یعنی یہ بتایا گیا کہ انسان کا اصل مقام اپنے خالق کے حکم کی تعمیل ہے۔ کیونکہ اس کے حکم کی تکمیل کے بغیر وہ بحیثیت انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ کیونکہ خالق کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا تو جینے کا ڈھنگ سیکھنے کے لیے اسے کسی

اور دروازے پر دستک دینی پڑے گی اور اس دروازے سے ہٹ کر سب دروازے وہ راستہ دکھائیں گے جو انسان کو منزل سے دور تو لے جا سکتا ہے لیکن منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ انسان اس دروازے سے ہٹے گا تو لازماً اسے خواہش ہی جس راستے پر چاہے گی چلائے گی اور اتباع ھویٰ کا راستہ لازماً ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے۔ یا وہ شیطان کا مرید بن جائے گا۔ شیطان خواہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے اس کے متعلق واضح اعلان ہے۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ

غرض جب خالق کو چھوڑا تو مخلوق سے رہنمائی لئے بغیر چارہ نہیں اور اس کا انجام تباہی کے بغیر کوئی دوسرا نہیں۔ یہی وہ بسم اللہ یہی وہ کلیدی سبق ہے جو قیام قیامت تک بنی نوع انسان کی حقیقی کامیابی کی قطعی ضمانت ہے۔

دوسری بات جو فرمائی باسم ربلٹ۔ اس میں دو حقائق جمع کر دیئے اوّل یہ خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی وصف مشترک نہیں لہٰذا اس کا قرب اس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے صفات کا واسطہ لازماً اختیار کرنا پڑے گا۔ اور صفات کی نمائندگی اسماء کرتے ہیں گویا معرفتِ ذات بواسطۂ صفات کی تعلیم ملتی ہے دوسری بات یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنا ذاتی نام استعمال نہیں فرمایا بلکہ اپنی ایک صفت ربوبیت کا ذکر اپنے صفاتی نام رب کا ذکر فرمایا۔ یعنی اصل کامیابی اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وہ اپنے رب سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اپنے رب سے ناواقف رہے:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

انسان کا قدم جب بھی پھسلا ہے، اسی مقام پر پھسلا ہے یا اپنے رب سے ناواقف رہا یا اپنے آپ کو رب سمجھنے لگا۔

انا ربکم الاعلیٰ کہنا اسی غیر انسانی حرکت کا اظہار ہے۔ پھر اس لفظ رب کے ساتھ ضمیر "ک" لگا کر ایک اور نفسیاتی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا۔ کوئی خواہ کیسا ہو مگر غیر ہو تو اجنبیت قائم رہتی ہے اور اگر اپنا ہو تو خود بخود دل اس کی طرف کھچا چلا جاتا ہے اس لئے فرمایا کہ رب ہے اور تیرا ہے اب بھی اگر انسان "اپنے" سے دور بھاگے اس کی بات نہ سنے تو یقیناً وہ غیروں کے ہتھے چڑھ جائے گا اور غیروں کا اعتبار کون کرتا ہے۔

پھر اپنی ایک اور صفت سے روشناس کرایا کہ الذی خلق یعنی تیرا رب وہ نہیں کہ تو اسے کہیں سے بنا بنایا مل گیا اور اسے اس پرائی چیز کو پالنا پڑ گیا بلکہ پیدا بھی اس نے کیا اور پرورش بھی اپنے ذمہ لے لی۔ لہٰذا تیرا تو اس سے دہرا تعلق ہوا۔ مگر اس تعلق کو قائم رکھنے، پختہ کرنے اور ترقی دینے کا مدار صرف اس پر ہے کہ پہلی بات یعنی اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا مقصد حیات سمجھے۔

پھر اس ربوبیت کی صفت کا ذکر خاص طور پہ جو کیا جا رہا ہے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ انسان مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔ جب وہ رب ہے تو اس کی ربوبیت کی تکمیل اسی صورت میں ہوتی ہے کہ جسم اور روح دونوں کی پرورش کرے۔ چنانچہ اس چوٹی پر یہ بتایا گیا بلکہ بشارت دی گئی کہ آج سے کامل ربوبیت کی تجدید ایک

کامل ہستی کے فیلئے شروع کی جا رہی ہے جس کا اجمالی ذکر اس ایک جملے میں کر دیا گیا کہ "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" اب اس کی تفصیل کا انتظار کرو۔

بہر حال بلندی کوہ پر چڑھنا شروع کیا۔ بلندی ایسی کہ قدم قدم پر کشش ثقل نیچے کی طرف کھینچتی ہے خیر جوں توں کر کے قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ مگر ذہن اس سوچ میں لگ گیا کہ اس پہاڑ کو جبل نور کیوں کہتے ہیں۔ پتھروں کے ایک ڈھیر کا نور سے کیا تعلق۔ پھر نور کی حقیقت یاد آئی ظاھر لنفسہ مظھر لغیرہ نور وہ ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے۔ یعنی نفس نور کے لئے محل نور لازمی ہے ایک ظرف ہے جس کا مظروف نور ہو۔ اللہ تعالیٰ نے نور کی مثال دی ہے۔ کمشکوٰۃ فیہا مصباح۔ المصباح فی زجاجۃ۔ الزجاجۃ کانہا کوکب دری یعنی اس کوکب کے لئے زجاجہ، مصباح اور مشکوٰۃ گویا محل ٹھہرے۔

اور نور نے اپنے اظہار کے لئے محل سے کام لیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو واقعی اس پہاڑ کا نام جبل نور ہی ہونا چاہیئے۔ یہ اس ہستی کی قیام گاہ بنا جو اپنے متعلق کہتی ہے۔ اول ما خلق اللہ نوری۔ یعنی اس نور کے لئے قلب نبوی زجاج بنا۔ سینہ نبوی مصباح بنا اور جسد نبوی مشکوٰۃ بنا اور اس جسد اطہر کے لئے اس پہاڑ کی چوٹی قیام گاہ بنی جہاں سے یہ نور ظاہر ہونے لگا اور منور کرنے لگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور نور کی نشاندہی فرمائی کہ فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا۔ وہ نور ہے اللہ کا کلام اللہ کی کتاب اور ظاہر ہے کہ سورج جب کسی پہاڑ کی اوٹ سے ظاہر ہوتا ہے تو پہلے اس کی ایک شعاع نمودار

ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ سارا طلوع ظاہر ہوتا ہے اور ایک عالم کو منور کر دیتا ہے تو اس شمس تاباں کی پہلی کرن اسی پہاڑ کی چوٹی سے نمودار ہوئی اور ۲۳ برس کے عرصے میں شمس بازغہ بن کر آفتاب عالمتاب کی طرح قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے نور اور روشنی ہدایت اور حکمت کا سامان دے دیا اس لئے بھی اس پہاڑ کا نام جبل نور ہونا چاہیئے۔

اسی سوچ بچار میں قریباً سوا گھنٹہ کے بعد چوٹی پر پہنچے۔ وہ جگہ دیکھی جسے غار حرا کہتے ہیں۔ اس کے اندر جا کر نفل پڑھے پھر ایک خوش الحان اور روشن ضمیر ساتھی سے درخواست کی کہ اس مقام کا حق ہے کہ وہی الفاظ اسے پھر سنائے جائیں۔ جو صدیوں پہلے اس نے سنتے تھے۔ ممکن ہے اس حق کی ادائیگی سے رحمت حق جوش میں آجائے۔ اور ہم سیاہ کاروں کے سینے بھی اسی نور سے منور ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے سورہ علق پڑھی یوں محسوس ہونے لگا جیسے آج نازل ہو رہی ہے۔ گو آج وہ جسم اطہر اس جگہ آج مخاطب نہیں مگر اس کے نام لیوا۔ اس سے نسبت رکھنے والے، اس کی معنوی اولاد، اس کے ناکارہ خدام مخاطب ہیں۔ یہ الفاظ سن کر قلب جھومنے لگا اور ذہن ان الفاظ کے مفہوم اور معانی میں مستغرق ہو گیا۔

اتنے مختصر الفاظ اور اتنی بڑی حقیقت کا بیان واقعی خالق نور ہی کا کام ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ؕ

این کتابے نیست چیزے دیگر است

چیزے دیگر کہہ کر اس نور کی ایک جھلک دیکھنے والا انسان کیا کچھ کہہ گیا ہے۔

کچھ دیر وہاں رکے. صوفیائے کرام نے اس مقام کے مناسب ایک خاص
قسم کے ذکرِ الٰہی کی نشاندہی کی ہے جسے ذکرِ اَغد کہتے ہیں. ہمارے میرِ قافلہ
نے احباب کو وہ ذکر کرایا. کیا کہوں:

قدرِ ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

پھر تھوڑی دیر بیٹھے رہے. خیال آیا کہ ادھر سے یہ ذرہ نوازی کہ علم الانسان
مالم یعلم اور ادھر سے یہ بے نیازی کہ

قرآن بھی پڑھ لیں گے ذرا پاس تو ہو لیں
والناس بھی پڑھ لیں گے ذرا ناس تو ہو لیں

لیکن ان الی ربک الرجعی کو بھی تو ذہن میں رکھا ہوتا اور اس دردناک منظر کو
بھی حافظے میں جگہ دی ہوتی جب:

لیکون الرسول علیکم شہیدا کا مرحلہ آئے گا تو کہیں صورت یہ نہ بن جائے
کہ وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً.

کاش ہمیں اب بھی ہوش آجائے اور

ز قرآں پیش خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز

کے مشورے پر عمل ہونے لگے.

اَللّٰھُمَّ ارزقنا بحرمت نبیک الکریم

واپسی شروع ہوئی. اب قدم قدم پر محسوس ہوا کہ چڑھائی تو واقعی صبر آزما تھی،
لیکن اترنا بھی کوئی کم مشکل نہیں. پھر ایسا نحیف و نزار انسان جس کی ۶۲ بہاریں

رشکِ خزاں بن کر گزر چکی ہوں۔

پھر یہ مرحلہ بھی طے ہوا مگر تاریخ کا یہ ورق رہ رہ کے سامنے آنے لگا کہ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ، آبادی سے دور تن تنہا ہفتہ عشرہ کے لئے سامان خورد و نوش ساتھ لاتا۔ اس بلندی پہ چڑھتا۔ اندھیری راتیں طویل دن اسی غار میں گزار دیتا۔ آخر کیوں ایسا کرتا اور یہاں اس کی ذات، کا مشغلہ کیا ہوتا؟

بس ذہن اس سوچ میں ڈوب گیا بظاہر وہ ایسے معاشرے میں رہتا تھا جس کے افراد کو اپنی قابلیت اپنی طاقت اور اپنی ذہانت پر اتنا ناز تھا۔ کہ وہ کسی کو پلے نہ باندھتے تھے۔ بلکہ اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو عجم یعنی گونگے سمجھتے تھے۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق سے ناآشنا تھے۔ لہٰذا وہ اپنے خالق سے کٹ چکے تھے۔ اس کے سامنے تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو ساری دُنیا کے سامنے اکڑتے تھے۔ مگر اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ یا آں شور اشوری یا ایں بے نمکی۔ اس اکڑ کو اس ذلت کے ساتھ کوئی مناسبت ہے مگر اتنی سطحی سی بات انکی سمجھ میں نہ آئی اور اس غار کی تنہائی میں راتیں گزارنے والا، اللہ کا برگزیدہ بندہ یہ منظر دیکھ کر کڑھتا تھا۔

دوسرے وہ تھے جو یہ کہا کرتے تھے۔ کہ ہمارے پاس ہمارے خالق کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت موجود ہے مگر ان کا رہن سہن اور ان کے طور طریقے اس بات کی مطلق شہادت نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی ہدایت کے راستے پر چل رہے ہیں۔ تیسرے وہ تھے جو ان دونوں سے بیزار تھے۔ مگر ان کے ساتھ کوئی تعمیری پروگرام نہیں تھا۔ صرف احساس بھلا کیا کر سکتا ہے۔

اللہ کا یہ محبوب اس صورتِ حالات کو دیکھ کر بل کھاتا تھا جب اس ماحول سے دل اچاٹ ہوتا تو گوشۂ تنہائی میں چلا جاتا اور اس فکر میں مصروف رہتا کہ سے ان حالات کو بدل سکتا ہوں۔ اسے اسی ذریعہ کی تلاش تھی اور وہ ذریعہ اسے مل گیا۔ ووجدک ضالا فھدیٰ:

یعنی تم متلاشی تھے ہم نے تمہیں وہ ذریعہ بتا دیا۔

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ

بس اس غار میں برسوں تک ذکر و فکر میں مشغول رہنا گویا اس عظیم کام کیلئے تیاری تھی، جس کا اظہار یوں کیا گیا۔ ان لک فی النہار سبحا طویلا لہذا اس کٹھن کام کے لیے تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ واذکر اسم ربک و تبتل الیہ تبتیلا۔ ذکرِ الٰہی بھی ہو، تبتل بھی ہو۔ یونہی جیسے بیٹری ایک گوشے میں رکھ کر مین (MAIN) سے ربط پیدا کر دیا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد چارج ہو جاتی ہے پھر وہ موٹر کو بھی دوڑائے پھرتی ہے اور لاؤڈ سپیکر کو بھی چالو کر دیتی ہے گویا ضیا پاشی اور رہنمائی کے لئے ذکرِ الٰہی تبتل اور فکر و مراقبہ ضروری ہے مگر لوگ ذکر و فکر کو غیر ضروری بلکہ بیکار سمجھتے ہیں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

خوب کہا اکبر الہ آبادی مرحوم نے:

جو خدا والے تھے صوفی ہو گئے

دل ستان بدر والے تھے شیعہ سنی ہو گئے

اور کیا بات کہہ دی اقبال نے:

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است   جز سرِّ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

گفتگو

ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی:-

۱- **سوال**: آج کل کے پیر فقیر یا صوفیائے عظام اکثر ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور ذکر میں لفظ اللہ کو استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ تلفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں، قرآن مجید میں تو ایسا آتا ہے اللہ لا الٰہ الا ھُوَ وغیرہ، یا ضمیر اشارے کی ضمیریں آتی ہیں۔

لہٗ ملک السّمٰوات والارض لہٗ میں ہٗ جو ہے اس کا اشارہ ماقبل کی طرف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غلط پڑھنے سے یہ ذکرِ الٰہی کیسے بن جاتا ہے اگر ذاتی نام کو ہی صحیح نہ پکارا جائے تو ذکر کا فائدہ ہی کیا۔ اگر اللہُ والی ضمہ کو موقوف کریں تو اللہْ پڑھا جائے گا یہ صحیح رہے گا۔

اگر حرفِ ہٗ کو اللہُ سے علیحدہ کریں تو اَلّٰہ رہ جاتا ہے جو اصل میں اَنْ لَا ہوگا، جب قانون عائد کریں گے اَنْ لَا بنے گا جس کے معنی نفی کے بنیں گے تو پھر یہ کیسے ذکرِ خدا ہُوا۔

اس لئے اللہ کے متعلق دلائل کے ساتھ جواب دیں۔

جواب: آپ نے سوال کی ابتدا جس جملے سے کی اس میں "آج کل" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے تصوّف و سلوک کی کوئی کتاب اتفاق یا غلطی سے بھی نہیں دیکھی ورنہ "آج کل" کا لفظ لکھنے سے پہلے آپ سینکڑوں مرتبہ سوچتے۔

آپ نے "ان لا" کے جال میں جو اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے اس سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں نتیجہ اس کے ہاتھ میں ہے جس نام کا تجزیہ کر کے حاصل تحقیق کو نفی تک پہنچایا یا اللہ ھُوَ یہ اسم مفرد نہیں بلکہ مرکب تام یا جملہ ہے جو مبتدا اور خبر سے مرکب ہے۔ اس کے دو اجزاء جب علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے تو تلفظ ہوگا اَللّٰہُ ھُوَ جب ان دونوں پر وقف ہوگا تو تلفظ یوں ہوگا، اللہْ ھُوْ۔

تعجب ہے کہ جو حقیقت ایک فلاسفر اور مغربی تہذیب کے پروردہ مسلمان کی سمجھ میں آگئی وہ ایک مشرقی حکیم اور ایک ابن مولوی کے ذہن میں نہیں آسکی سُنئے وہ کیا کہتا ہے ؎

جہانِ دل جہانِ رنگ و بُو نیست
درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ھُوَ نیست

بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گیا ہے اور بڑے وثوق سے کہہ گیا ہے ؎

نصیبِ اوست مرگِ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ھُوَ زیست

۲- **سوال**:- معلوم ہوا ہے کہ جناب نے ذکر کے لئے نئے طریقۂ جدید نکالا ہے نہ زبان سے ذکر ہوتا ہے یعنی سانس کے ذریعے ذکرِ خدا ہوتا ہے اور سر بھی مارا جاتا ہے جیسے مجنون ہو اور ناک سے بھی کوئی آواز محسوس ہوتی ہے جیسے شوں شوں کی آواز۔ عرض یہ ہے کہ یہ طریقہ ذکر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے ثابت ہے یا صحابۂ کرام سے یا کسی امام سے ۔ یا کسی اور بزرگ دین سے براہِ کرم جواب سے مطمئن فرمائیں ۔

جواب: آپ کے سوال کا پہلا جملہ ہے "معلوم ہوا ہے کہ جناب نے ذکرِ خدا کے لئے طریقہ جدید نکالا ہے" تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو معلوم کیسے ہوا پھر دوسرا سوال ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ یہ طریقہ جدیدہ ہے ، تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم اس طریقہ کے موجد ہیں ۔ اس جملے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک علم تصوف وسلوک کا تعلق ہے آپ اس سے بال بال بچ گئے ہیں اور جہاں تک تصوف وسلوک کے عملی پہلو کا تعلق ہے آپ نے اس کوچہ میں قدم ہی نہیں رکھا ۔ بہر حال اگر آپ ذکر الٰہی اور لطائف کے متعلق علمی حد تک واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ کی القاف القدس کا مطالعہ فرمالیں اور جہاں تک ذکر کے متعلق مختلف طریقوں کا تعلق ہے آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ضیاء القلوب کا مطالعہ فرمالیں ۔ اس کے مطالعہ کے بعد آپ ایک اور مشکل میں پھنس جائیں گے ذکر اللہ ذکر یک ضربی ، دو ضربی وغیرہ کا بیان پڑھ کر آپ سوچیں گے کہ یہ ضرب کوئی ہتھوڑے سے یا کلہاڑے سے ماری جاتی ہے ، اگر یہ ضرب جسم کی حرکت یا سر کی حرکت سے سمجھی جائے تو آپ کا سوال کہ سر بھی مارا جاتا ہے ، آپ کو اور پریشان کرے گا اور اسے آپ جنون سمجھتے ہیں مگر نبی کریمؐ نے فرمایا " اکثروا ذکر اللہ حتیٰ یقولوا مجنون یعنی اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں تو دیوانہ بننا مطلوب ہے اور آپ یہ سمجھ بیٹھے دیوانوں کی طرح ذکر الٰہی کرنا معیوب ہے ، اب نبی کریمؐ سے آپ کا اختلاف دور کیسے ہو ، اللہ تعالیٰ ہی کوئی صورت پیدا کر دے ۔ رہا یہ سوال کہ "کیا یہ طریقہ ذکر نبی کریمؐ سے یا صحابہ سے ثابت ہے" تو اس سلسلے میں ایک اصولی بات عرض کرتا ہوں ایک ہوتا ہے مقصد اور ایک ہوتا ہے ذریعہ ، مقصد علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے مگر تدبیر بدلتی رہتی ہے اور تدبیر کے بدلنے سے یہ ہرگز نہیں سمجھا جاتا کہ مقصد بھی بدل گیا ہے اس اصول کو سامنے رکھیں اور ذیل کے سوالات پر غور فرمائیں ۔

(ل) حضورؐ کے زمانہ میں جہاد فرض تھا اور مقصد تھا مگر ذریعہ یا تدبیر یہ تھی کہ تیر سے تلوار سے یا نیزے سے لڑائی ہوتی تھی ، سواری کے لئے گھوڑا اور اونٹ استعمال ہوتا تھا ، اب بھی جہاد فرض ہے مگر کیا اب بھی اسی تدبیر پہ اکتفا کرنا پڑے گا جو اس زمانے میں اختیار کی گئی ؟ کیا جدید آلات حرب اور سواری اور بار برداری کے لئے مشینی آلات کا استعمال اس لئے ناجائز ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ یا صحابہؓ کے زمانہ میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہوا ۔

(ب) تعلیم دین فرض ہے علی قدر مراتب حضور اکرمؐ کا طریقہ کیا تھا ، آپ کیسے دین کی تعلیم دیتے تھے ؟ اب بھی دین کی تعلیم دینا اور حاصل کرنا ضروری ہے مگر نبی کریمؐ اور صحابہؓ نے نہ تو صرف ونحو پڑھی ، نہ بخاری اور ترمذی کا درس ہوتا تھا نہ جلالین مدارک اور بیضاوی کی تدریس ہوتی ، نہ ہدایہ شرح وقایہ سلم العلوم شرح جامی کے درس دیئے جاتے تھے اگر تعلیم دین کے لئے یہ سب تدابیر اختیار کرنا دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ کی تصریح مخالفت ہے تو دنیا بھر کے دینی مدارس بند کر دینے ضروری ٹھہرے ۔

(ج) تبلیغ واشاعتِ دین فرض ہے، حضور اکرمؐ نے عمر بھر تبلیغ کی مگر طریقہ کیا تھا۔ اگر اس کے بغیر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ایجادِ بندہ ہے تو یہ کتابیں دھڑا دھڑ کیوں لکھی جا رہی ہیں، ماہنامے اور ہفتہ وار رسائل کیوں پھیلائے جا رہے ہیں، کیا اسے نبی کریمؐ کی مخالفت کا نام دیں گے۔ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع میں جبلِ رحمت پر کھڑے ہو کر جو خطبہ دیا تھا آپ کو معلوم ہے کہ سامعین کی تعداد کتنی تھی اور کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اتنے آدمیوں تک حضورؐ کی آواز کیسے پہنچی؟ یہ معجزہ تھا کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہر کان تک یوں پہنچے جیسے پاس ہی کھڑا کوئی سنا رہا ہے۔ لیکن آج اتنی مخلوق کو سنانے کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے بغیر کوئی صورت ممکن نہیں تو آج اس کا استعمال اس لئے ناجائز قرار پائے گا کہ حضورؐ یا صحابہؓ نے لاؤڈ سپیکر استعمال نہیں کیا،

(د) آپ ایک آدمی کو کہتے ہیں کہ فلاں جگہ جو آدمی سو رہا ہے اُسے آواز دو اور جگا لاؤ۔ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے کہ جناب میں نے آواز دی وہ نہیں جاگا تو آپ اگر کہیں کہ میں نے سینکڑوں آدمیوں کو اس طرح جگایا کہ آواز دی اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میں دبے پاؤں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ آہٹ پا کر ہی بیدار ہو گئے، وہ کہے کہ حضرت آئیے ذرا یہ تجربہ اس گھوڑے بیچ کر سونے والے پر آزمائیے آپ آواز پہ آواز دیتے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اب اس کی صورت یہ ہے کہ آپ واپس آ جائیں اور وہ سویا کریں، یہ صورت آپ اس وقت اختیار کریں گے جب جگانا مقصود نہیں بلکہ یہ محض دل لگی تھی دوسری صورت یہ کہ آپ کو اسے ہر حال میں جگانا ہے اب آپ کو تدبیر میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ آواز دے کر آپ چھوڑ نہیں دیں گے بلکہ آپ اُسے جھنجھوڑیں گے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ماریں گے، آپ اسے اُٹھا کر بٹھا دیں گے بلکہ اُسے پکڑ کر چارپائی سے اُتاریں گے اور چند قدم چلائیں گے پھر جا کر اس کی آنکھ کھلے گی کوئی آپ سے کہے کہ آپ نے یہ نیا طریقہ کیوں ایجاد کیا، تو آپ یہی کہیں گے کہ اسے جگانا مقصد تھا اور اس کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، تدبیر تو محض ذریعہ ہے جسے بدلا جا سکتا ہے۔

اسی سے سمجھ لیجئے کہ حضور اکرمؐ کی نگاہ میں وہ اثر تھا کہ برسوں کے خفتہ قلوب بس ایک نگاہ سے بیدار ہو گئے۔ اب وہ نگاہ کوئی کہاں سے لائے کہ قتل کے ارادے سے آنے والا سامنے آئے تو قدموں میں گر جائے۔ اب تو بھائی خفتہ دلوں کو جگانے کے لئے سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ کام وہی کرے جسے سونے والوں سے خیر خواہی ہو اور جسے اس سے جتن کرنے پڑتے ہیں مگر یہ کام وہی کرے جسے سونے والوں سے خیر خواہی ہو اور جسے اس سے محبت ہو جس نے جگانے کی ذمہ داری سونپی ہے ؎

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کہ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

سوال ۲ (۱) اس عاجز کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے کثرتِ ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے، درسِ نظامی سے نکلتے ہی غنیۃ الطالبین، کشف المحجوب، مولانا تھانوی کی کل تصانیف، مولانا احمد علیؒ کے تبلیغی رسائل اور فتوح الغیب سے روحانی فیض لیا۔ ماشاء اللہ ذکر کی مواظبت اور اقامتِ صلوٰۃ طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہیں۔ سنت کی پابندی، اوقاتِ معینہ کی مسنون دعائیں اور تہجد بالالتزام بحمد اللہ عادت میں داخل ہیں، ودائل السلوک کے

مطالعہ سے یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ کسی شیخ کامل سے فیض روحانی بھی حاصل کرنا ضروری ہے لہذا مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ سے استفادہ کا ارادہ ہے۔

(ب) اس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامت دین نہایت اہم فریضہ ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ الخ فلا وربک لا یؤمنون الخ سے ظاہر ہے کہ اسلامی قانون یعنی نظام مصطفےٰ کے سوا کسی طاغوتی قانون کو برداشت کرنا اور اس غیر اسلامی ماحول میں چند ساعت ذکر و تسبیح کرنا اور اصلاحِ قلب کی کوشش میں رہنا باقی سارا وقت مرید کا ایسے ماحول میں گذارنا جہاں چکلوں کی آمدنی سے سکسی گندم خریدی اور کھلائی جاتی ہے جہاں سودی کاروبار اس وعید کے باوجود کہ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ جاری ہے ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے مدہ کے جائز کیا فائدہ دے سکتا ہے کا متوجہ ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامت دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

(ج) تسبیح تو آسان ہے تمام غیر مکلف بھی تسبیح کرتے ہیں ہاں وہ تکبیر نہیں کر سکتے انسان خدا کا نائب ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے، تلوار سے اسلام کی بڑائی ثابت کرے۔ وربک فکبر تاکہ ملک میں اسلامی پاکیزہ معاشی نظام رائج ہو بقول اقبال رحؒ ؎

یا آفاق و افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلا و نباتات و جمادات

(د) مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح برائے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے ....

(ہ) اس گناہ گار کو ذکر و فکر سے بہرہ ور کرنے سے کچھ نہیں ملا

(و) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامت دین کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ذکر و فکر موثر اور پائیدار ثابت ہو۔

جواب: (الف) آپ کے گرامی نامہ میں مجھے جا بجا تضاد کے نمونے نظر آئے مگر میں نے اس کی توجیہ یہی کی کہ ایک کم علم آدمی علماء کے ارشادات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھاتا ہے لہذا یہ میری سمجھ کا قصور ہے۔

شروع میں آپ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ سے روحانی فیض حاصل کیا ہے، اس کا اثر ہے کہ ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ سنت کی پابندی اور تہجد بالالتزام بحمد اللہ عادت میں داخل ہے یعنی جہاں تک کسب، ریاضت محنت کا تعلق ہے آپ کی عملی زندگی اس قسم کی ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں عمل صالح کہتے ہیں۔

جہاں تک قانون توارث کا تعلق ہے آپ فرماتے ہیں کہ کثرت ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے اور جہاں تک علمی پہلو کا تعلق ہے آپ فرماتے ہیں کہ درس نظامی کی تکمیل ہو چکی ہے پھر آپ فرماتے ہیں کہ مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ سے استفادہ کا ارادہ ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں جس کے حصول کے لئے آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں جبکہ عملی، علمی اور موروثی کمالات تو یہ سب آپ میں موجود ہیں بہرحال یہاں آپ ایک طالب، متلاشی و سائل کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں اور آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ "کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامت دین کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ذکر و فکر موثر اور پائیدار ثابت ہو" یعنی آخر میں آپ استاد و ناصح مرشد

اور ہادی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں۔ اس تضاد کو کوئی کیسے دور کرے۔

(ب) آپ فرماتے ہیں اس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامتِ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے " ہے جمالو" کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اصل کام تو ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامتِ دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو خیال آرائی اور مشورہ دینے کا یہ کونسا موقع ہے اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر سے کہے کہ میں علاج کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں پھر اسی وقت کہنا شروع کر دے کہ میرے خیال میں فلاں دوائی بڑی اچھی ہے اور ضروری ہے تو ڈاکٹر اس کے بغیر کیا کہہ سکتا ہے کہ صاحب جب آپ خود دوائی تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو میرے پاس آنے اور علاج کرانے کا ارادہ ظاہر کرنے کا مطلب کیا ہے ذرا اس تضاد کو تو دور کیجئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ "اقامت دین" کس بلا کا نام ہے اگر دین سے مراد اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کا نام ہے تو ذکر الٰہی کے متعلق اللہ و رسول نے کیا حکم نہیں دیا اگر سینکڑوں آیات قرآنی اور سینکڑوں احادیث نبوی ؐ میں ذکر الٰہی کی کثرت کا حکم پایا جاتا ہے تو اس حکم کی تعمیل کرنا اور ذکر کرنا کیا دین سے الگ کوئی چیز ہے اگر نہیں تو آپ اقامتِ دین کی مہم سے اس حکم کو کیوں خارج سمجھتے ہیں۔

چوتھی بات " اقامتِ دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے " مشورہ تو مناسب ہے مگر مقابلہ کے لئے سلیقہ بھی درکار ہے تیاری بھی ضروری ہے اسلحہ بھی چاہیئے اب دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کا خدا سے اتنا تعلق ہے کہ اس کا نام لینا بھی اسے گوارہ نہیں، وہ خدا کا بڑا ہی وفادار سپاہی ہوا جو خدا کا باغی ہے وہ باغیوں کا مقابلہ کرے گا یا خود باغیوں میں شامل ہو کر ان کی قوت میں اضافہ کرے گا، جو شخص اپنے پانچ فٹ جسم پر دین کی چھاپ نہیں لگا سکتا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت میں اپنے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں جو اپنے قریبی ماحول میں عملاً شیطان کی برتری تسلیم کئے بیٹھا ہے وہ خدا کے باغیوں کا کیا خاک مقابلہ کرے گا، ایسے خدا بیزار تفرقہ ڈالنے لذت پرست اور محض باتونی سپاہیوں سے مل کر جو فوج بنی ہو وہ خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرے گی کیا اس مفروضے کو معقول تصور کرنے کے لئے کوئی ذی ہوش انسان تیار ہے۔ اس مہم کی تیاری اور سپاہی کے اسلحہ کی نشاندہی تو خود اس ذات نے کر دی جس نے چودہ صدیاں پہلے اقامتِ دین کی مہم چلائی تھی حضور اکرم ؐ کا فرمان تو آپ کو یاد ہو گا کہ شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے انسان کے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ انسان اپنے دل کے گرد ذکر الٰہی کا حصار تعمیر کرے اور کما قال ؐ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو اسلحہ اتنے بڑے باغی کو شکست دینے کے لئے بقول رسول ؐ کارآمد ہے وہ اس کی ذریت اور انسانی شطونگڑوں کے مقابلہ میں کوئی کام نہیں آ سکتا ذکر الٰہی تو در اصل ماحول کو بدلنے کی تیاری کا نام ہے پہلے خود کو بدلو پھر ماحول کو بدلو اور یہ نرا دعویٰ نہیں تاریخی حقیقت ہے شیخ عبدالقادر جیلانی امام ربانی مجدد الف ثانی علی ہجویری ؒ امام شامل ترکی کے پاس یہی اسلحہ تو تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ حرا کے بعد بدر کا نمبر آیا کرتا ہے

(ج) انسان خدا کا نائب ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ تسبیح اور تکبیر میں مغائرت کا تصور کہاں سے پیدا ہوا ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے حق یہ ہے کہ تسبیح کے بغیر تکبیر ہو ہی نہیں سکتی جب عقیدے میں اس کی تسبیح اور تقدیس راسخ نہ ہوگی اس کی تکبیر کے لیے قدم کیسے اٹھیں گے، ذکر الٰہی کا اثر ہے کہ اللہ کی صفات پر یقین جم جاتا ہے ذاکر جب لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ لا نافع الا اللہ ـــ اس یقین کے بغیر خدا کے باغیوں کے مقابلہ کے لیے میدان میں اترنا ایسا ہے جیسے ایک نہتا آدمی توپوں اور ٹینکوں کے مقابلہ کے لیے میدان میں آ جائے۔ اور اگر تلوار اس کے ہاتھ میں ہو جس کے دل میں خدا کے علاوہ اور سب کی بڑائی کا عقیدہ راسخ ہو کیا اس تلوار سے اللہ کی بڑائی ثابت ہو سکے گی وہ پاکیزہ معاشی نظام رائج کر سکے گا!

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا مشورہ ہے آدمی ذکر الٰہی کے لئے اس وقت تک انتظار کرے جب پاکیزہ معاشرہ قائم ہو جائے حالانکہ یہ ترتیب ہی الٹی ہے اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم یعنی ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو اللہ کو بھلا بیٹھے ہیں اس کے نتیجہ میں ان کی ایسی مت ماری گئی کہ اپنے نفع و نقصان کی سدھ بدھ بھی نہ رہی۔ یعنی جس طاغوتی ماحول میں ہم گھرے ہوئے ہیں یہ تو نتیجہ ہے اللہ کو بھلا دینے کا پھر یہ کیونکر ہو کہ ہم اللہ کی یاد کے قریب ہی نہ جائیں مگر ماحول پاکیزہ ہو جائے

رہا اقبال کے اشعار کا حوالہ دینا تو حقیقت یہ ہے کہ یار لوگوں نے اقبال کے کلام سے تو امرت دھارا کا کام لیا ہے جب اقبال کا کلام ہی قولِ فیصل ہے تو سنیئے

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست
درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
درین عالم بجز اللہ ھو نیست

بلکہ اس سے بھی زیادہ زور دار الفاظ میں فیصلہ دیتا ہے

نصیب اوست مرگ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ھو زیست

(د) آپ فرماتے ہیں "مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح برائے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے"

بات تو بالکل درست ہے مگر اس سے ذکر سے بیزاری کا تاثر کہاں سے پیدا ہوتا ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ "برائے گناہ" کے حلقے سے لوگوں کو نکال کر ذاکرین کے حلقے میں داخل کیا جائے تاکہ ذاکرین کا حلقہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات دور دور تک پھیلیں اور "برائے گناہ" کا حلقہ تنگ ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات کم ہوں، حضور اکرم ﷺ نے اپنی مکی زندگی میں خصوصاً ابتدائی تین برسوں میں یہی طریقہ اختیار فرمایا جبھی تو امام مالک یہاں تک فرما گئے ہیں کہ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔

(ہ) آپ فرماتے ہیں "اس گنہ گار کو عمر بھر ذکر و فکر کرنے سے کچھ نہیں ملا"

آپ کی اس محرومی کا افسوس تو ضرور ہے مگر اس سلسلہ میں چند امور قابل غور ہیں پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے

ذکر وفکر کرنے سے پہلے یہ طے کر لیا ہو گا کہ مجھے یہ کچھ ملے گا
جب وہ نہ ملا خواہ اور بہت کچھ مل گیا ہو تو آپ نے یہی محسوس
کیا کہ مجھے کچھ نہیں ملا، ایسا احساس عقلاً غلط ہے کیونکہ
بندہ کی یہ طاقت نہیں کہ اپنی پسند کے مطابق لے بلکہ اس کا
انحصار تو دینے والے کی پسند پر ہے پھر شکایت کیوں؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ فرما چکے ہیں کہ ذکر و فکر
کی عادت بچپن سے ورثہ میں ملی تھی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ
اس میراث کے ساتھ کیا اس امر کی تعیین بھی ورثہ میں ملی تھی
کہ ذکر و فکر سے یہ ملے گا۔ اگر یہی بات ہے تو آپ کا یہ احساس
بجا ہے کہ کچھ نہیں ملا۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے شروع میں اللہ کی نعمتوں یا اپنے
اوصاف اور کمالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "ذکر کی مواظبت
اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے سنت کی پابندی اور
تہجد بحمد اللہ بالالتزام عادت میں داخل ہے"

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر صرف ذکر ہی نہیں
کرتے رہے بلکہ اقامت صلوٰۃ تہجد اور سنت کی بھی پابندی کرتے
رہے۔ ذکر و فکر سے تو بقول آپ کے آپ کو کچھ نہیں ملا تو کیا اقامت
صلوٰۃ تہجد اور سنت کی پابندی سے بھی کچھ ملا ہے یا یہ خانے بھی
خالی ہیں تو جب ذکر و فکر سے کچھ نہ ملنے سے ان کی افادیت
ختم ہو گئی اور آپ نے یقیناً یہ معاذ اللہ عبث کام چھوڑ دیا ہو گا
تو صلوٰۃ تہجد و اتباع سنت کا تکلف بھی چھوڑ دیا ہو گا خدانخواستہ
اگر صورت حال یہ ہے تو بڑی افسوسناک ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ تہجد اور اتباع
سنت سے تو آپ کو کچھ ملا ہے صرف ذکر و فکر سے کچھ نہیں ملا
اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کرنے سے کیا ملا؟

ہر محنت کی مزدوری کی تعیین کچھ تو خالق نے خود فرما دی ہے، البتہ
مزدوری کے ملنے اور اس کے ظاہر ہونے کے محل جدا ہیں مثلاً
اقامت صلوٰۃ کا اثر فرمایا کہ تنھی عن الفحشاء والمنکر نماز
بے حیائی کے کاموں سے اور گناہوں سے روکتی ہے اس لئے
اگر نماز نے آپ کی عملی زندگی میں یہ اثر دکھایا تو ظاہر ہے کہ کچھ
مل گیا اسی طرح تہجد کا فائدہ بتایا کہ ان ناشئۃ اللیل ھی
اشد وطاءً واقوم قیلا یعنی رات کو اٹھنا ہے تو بڑا ریاضت
کا کام مگر اس کا اثر یہ ہے کہ ضبط نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اور
اپنے خالق سے جو باتیں ہوتی ہیں وہ دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں
اگر تہجد کی پابندی نے آپ کی سیرت میں یہ بات پیدا کر دی ہے تو ظاہر
ہے کہ کچھ مل گیا ہے، سنت کی پابندی اور احکام الٰہی کی تعمیل کا ایک
صلہ اور بھی بیان ہوا ہے کہ من یطع اللہ ورسولہ فقد فاز
فوزاً عظیماً مگر اس فوز عظیم کا نظارہ اس وقت ہو گا جب زندگی
لپیٹی جا چکی ہو گی۔

اسی طرح ذکر کے بھی دو اثرات بیان ہوئے ہیں اول الا
بذکر اللہ تطمئن القلوب تو کیا آپ کو عمر بھر ذکر کرنے سے اطمینان
قلب حاصل ہوا یا نہیں اگر حاصل ہوا تو ظاہر ہے کہ کچھ مل گیا ہو گا
اگر نہیں حاصل ہوا تو اس کی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ آپ کو اس کی
ضرورت ہی نہیں تھی اور آپ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ آم کے درخت
پر انار لگیں گے اور وہ نہ لگنے تھے اور نہ لگے۔ دوسری صورت یہ ہے
کہ آپ نے عمر بھر ذکر نہیں کیا، بلکہ ذکر کی ایکٹنگ کی۔ جب خالق نے
آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی ہے تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آگ
جل بھی رہی ہے اور نہ گرمی دیتی ہے نہ جلاتی ہے بلکہ برف کی قاش
محسوس ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ آگ جلائی ہی نہیں گئی بلکہ شعلوں
کی تصویر بنائی گئی ہے۔

ذکر کا دوسرا اثر فرمایا فاذکرونی اذکرکم یعنی میرے بندو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس امر کی تعیین کردہ بندے کو یاد کرتا ہے مادی ذرائع سے ممکن نہیں ایک ہی طریقہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کی بات پر یقین کرے، تو کیا آپ اپنے خالق کی اس یقین دہانی پر بھی یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ کچھ نہیں ملا تو اس کا کوئی علاج نہیں ملا کیونکہ یہ تو "میں نہ مانوں" والی صورت ہے

قرآن کریم کے بیان سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ حضورؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی جسے اتباع سنت کہتے ہیں کے لئے چند اوصاف درکار ہیں اول لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر دوسرا ذکر اللہ کثیراً گویا اتباع سنت وہی کر سکتا ہے جو ذکر کثیر کا عادی ہو۔ تو جب آپ فرماتے ہیں کہ سنت کی پابندی عادت میں داخل ہے تو ظاہر ہے کہ ذکر الٰہی نے ہی آپ کے اندر سنت کا جذبہ اور سلیقہ پیدا کیا پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ذکر الٰہی سے کچھ نہیں ملا۔

سوال (۴): میں خط جلد اس لئے نہ لکھ سکا کہ مجھے تنظیمی امور کے لئے آئندہ دو سال کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

جناب حافظ صاحب! ذکر سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے سوال تو طریقہ ذکر کا ہے۔ میں آپ کو چھ سوال لکھ رہا ہوں واضح حوالے سے جوابات لکھ کر روانہ کریں تاکہ میں اپنی تفتیش مکمل کروں اور اپنی جماعت کے اجلاس میں پیش کروں۔

(۱) جو طریقہ ذکر آپ حضرات کرتے ہیں اس کی ابتداء کس صاحب نے کی؟

(۲) جس صاحب نے ابتداء کی اس کا تعلق کن علماء سے ہے؟

(۳) کیا پاکستان کے تمام علماء اسے ولی یا مجدد مانتے ہیں؟

(۴) کیا انہوں نے کسی ظالم حکمران کے سامنے حق کی آواز بلند کی؟

(۵) کیا انہوں نے تحفظ ختم نبوت، شان صحابہؓ کے لئے کبھی کوئی قربانی دی ہے۔؟

(۶) آپ سب لوگ انہیں ولی یا مجدد کیوں تسلیم کرتے ہیں؟

جناب حافظ صاحب میں نے مندرجہ بالا سوال ایسے لکھ دئیے ہیں جن کا جواب اب آپ کو یا آپ کی جماعت کے کسی دوسرے صاحب کو بالتفصیل اور حوالے دیکر دینا ہوگا۔ اور اگر کسی سوال کا جواب کسی کتاب میں ہو تو وہ بھی ارسال کر دیں تاکہ میں اپنی تفتیش مکمل کر کے منظوری کے لئے اجلاس میں پیش کروں۔

طریقہ ذکر کے علاوہ چار سوال اور ہیں۔

(۱) یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے دل اور رسول اللہؐ کے دل کے درمیان ایک باریک تار لگی ہوئی ہے۔

(۲) ۶ ماہ میں رسول اللہؐ سے شرف ملاقات آپ لوگ کس طرح حاصل کرتے ہیں۔

(۳) مُردے کی روح سے کس طرح بات کی جا سکتی ہے۔

(۴) قبر کا عذاب کس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

الجواب

آپ کے سوالات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک حصے کا تعلق پہلے چھ سوالوں سے ہے دوسرا بقیہ چار سوالوں سے متعلق ہے جیسا کہ خود آپ نے اظہار فرما دیا ہے۔

جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے ایک اصولی بات یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے مقصد اور غایت دوسرا ذرائع اور تدبیر، مقاصد اور غایات دوسرا ذرائع اور تدابیر، مقاصد اور غایات نہیں بدلتے البتہ بدلے ہوئے حالات میں ذرائع اور تدبیر میں تبدیلی آسکتی ہے اور یہ تبدیلی صرف مقاصد کے حصول کے لئے ایک مناسب اقدام ہوتا ہے

اس سے مقاصد کی نفی ہو جاتی ہے مثال کے طور پر دیکھیے فن طب کا مقصد صحت جسمانی کا حصول ہے ایک وقت تھا کہ علاج کے لئے ٹھوس یا مائع ادویہ حلق سے اُتار کر معدے میں پہنچائی جاتی تھی اور معمولی بیماری کے لئے دنوں بلکہ ہفتوں علاج جاری رکھا جاتا تھا، رفتہ رفتہ طبائع میں نزاکت آنے لگی برداشت کی قوت کم ہو گئی تو اس فن میں نئے طریق علاج اختیار کئے جانے لگے اور زود اثر علاج کے لئے انجکشن اور بجلی کے ذریعے علاج ہونے لگا۔ اب اگر کوئی سادہ لوح کہے کہ پہلے اطباء علاج کے لئے دوائیں کھلایا پلایا کرتے تھے، اب یہ کیا ستم ہے کہ علاج کے لئے جسم کو چھیدا جا رہا ہے اور بجلی کے جھٹکے لگائے جا رہے ہیں ایسے دانشور کو اس کے بغیر کیا جواب دیا جا سکتا ہے کہ مقصد صحت کا حصول ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ طریق علاج نہایت زود اثر ہے اور کامیاب ہے مگر ساتھ ہی یہ طریقہ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں محض تدبیر ہے جو حالات کے بدلنے سے بدل سکتی ہے۔

اگر یہ اصولی بات آپکی سمجھ میں نہ آئے یا آپ کو مطمئن نہ کر سکے تو آپ مندرجہ ذیل سوالات پر غور فرمائیں ممکن ہے اس کوشش میں آپکو اپنے چھ سوالات کا جواب مل جائے۔

(۱) چوہدری صاحب! دین کا علم حاصل کرنے کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سوال کونسا طریقہ تعلیم کا ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(۱) جو طریقہ تعلیم اس وقت رائج ہے اس میں عموماً یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، صرف بہائی، نحو میر، کافیہ، شرح جامی اصول الشاشی، قطبی، میبذی، صدرا، شمس بازغہ، قدوری، شرح وقایہ، ہدایہ اولین و آخرین، بخاری ابو داؤد، ترمذی، مدارک، جلالین، بیضاوی وغیرہ آپ ان میں ہر کتاب کے متعلق جواب دیں کہ سب سے پہلے کس نے یہ کتاب پڑھانی شروع کی۔ نبی کریمؐ کے زمانے میں ان کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔

(۱۱) ہر کتاب کی تدریس شروع کرنے والے صاحب کا تعلق کن علماء سے تھا۔

(۱۱۱) کیا پاکستان کے تمام علماء اسے مجدد مانتے ہیں۔

(۱۷) کیا اُنہوں نے کسی ظالم حکمران کے سامنے حق کی آواز بلند کی

(۷) کیا اُنہوں نے تحفظ ختم نبوت، شانِ صحابہؓ کے لئے کبھی کوئی قربانی دی۔

(۷۱) آپ لوگ اُنہیں مجدد کیوں تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ چوہدری صاحب! تبلیغ و اشاعت دین کے فریضہ کا کون منکر ہے۔ سوال تو طریقہ تبلیغ کا ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ :-

(۱) سب سے پہلے کس صاحب نے کتابیں تصنیف کر کے اشاعتِ دین کا کام شروع کیا؟ کس صاحب نے سب سے پہلے پمفلٹ چھپوا کر عوام میں پھیلائے؟ کس صاحب نے سب سے پہلے روزنامے، ماہنامے اور سہ ماہی جرائد شائع کئے؟

جن صاحب نے سب سے پہلے یہ کام کئے ان کے متعلق پانچ سوالوں کے جواب دیجئے۔

۳۔ چوہدری صاحب! تقریر و بیان کے ذریعہ دین کی آواز عوام تک پہنچانے کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے سوال تو طریقۂ تبلیغ کا ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ

(۱) سب سے پہلے کس نے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنا شروع کیا، نبی کریمؐ نے تو ایک لاکھ ۲۰ ہزار کے مجمع کے سامنے

صرف اپنی زبان مبارک سے خطبہ دیا تھا اور سب نے حضورؐ کی آواز سن لی تھی۔

(۲) ان صاحب کے متعلق بقیہ پانچ سوالوں کے جواب دیں

(۴) چودھری صاحب! جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ کا کون انکار کر سکتا ہے۔ سوال تو طریقۂ جہاد فی ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ:۔

(۱) سب سے پہلے کس نے بندوق سے جہاد کرنا شروع کیا؟ کس نے مشین گن سٹین گن، چلائی کس نے موٹر جیپ ٹینک وغیرہ جہاد میں استعمال کئے کس نے بحری جہاز تارپیڈو شروع کئے؟ کس نے بمبر زن اسٹر استعمال کئے حضورؐ کے طریق جہاد سے ہٹ جانے کی ابتدا کس نے کی؟

(۲) اس آدمی کے متعلق باقی پانچ سوالوں کے جواب دیں۔

(۵) چوہدری صاحب! حج بیت اللہ، اسلام کا ایک عظیم رکن ہے کوئی مسلمان اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا سوال تو بیت اللہ تک پہنچنے کے طریقے کا ہے اس لئے آپ جواب دیں کہ:۔

(۱) گھوڑوں اور اونٹوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے کس نے موٹروں اور بسوں کے ذریعہ حج کے لئے جانا شروع کیا؟ کس نے سب سے پہلے حج کے سفر کے لئے ہوائی جہاز کو ذریعہ سفر بنایا۔

(۲) ایسے اشخاص کے متعلق باقی اپنے پانچ سوالوں کے جواب دیں۔

گو اس قسم کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر میں نے طوالت سے بچنے کے لئے ان پانچ امور پر اکتفا کیا یہ پانچوں شعبے دین کے اہم امور ہیں ذکر الٰہی بھی دین کا اہم جزو ہے بلکہ ہر عبادت ہر معاملہ اور اخلاق کی اصل روح ذکر الٰہی ہے اگر کوئی بڑی سے بڑی عبادت بھی ذکر الٰہی کی روح سے خالی ہو تو وہ محض صورت عبادت ہے حقیقت عبادت مفقود ہو گی۔ اس لئے ان سوالوں کے جو جوابات آپ کو مل سکیں گے وہی آپ کو ذکر الٰہی کے سلسلے میں بھی کام آئیں گے اور آپ کو پھر یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی:۔

حافظ صاحب! ذکر الٰہی سے کون انکار کر سکتا ہے سوال تو طریقۂ ذکر کا ہے۔"

اچھا تو یہ ہے کہ آپ نے جس "تفتیشی" جماعت کا ذکر کیا ہے یہ سوالات ان کے سامنے رکھیں اور سب "محققین" مل کر ان سوالوں کے جواب تیار کریں، تاکہ آپ کی "تفتیش" مکمل ہو جائے

دوسرے حصے میں آپ نے جو سوالات لکھے ہیں ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ "یہ" کس طرح ہو سکتا ہے اس کا جواب حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں اول یہ کہ جو کام کرنے کا ہے وہ کہنے سننے "سے نہیں ہو سکتا مثلاً آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آدمی خوش نویس کیسے بن سکتا ہے تو آپ اس فن کی کتابیں پڑھ کر تمام معلومات حاصل کرنے اور فنی باریکیوں کے جاننے کے باوجود خوشنویس نہیں بن سکتے۔ ہاں ایک طریقہ ہے کہ کسی ماہر خوشنویس کے پاس بیٹھیں اس کی ہدایت کے مطابق لکھنا شروع کر دیں اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ عرصہ تک لکھتے رہنے کے بعد آپ خوش نویس بن جائیں گے اگر آپ کی لکھائی ایسی ہے جیسے پنجابی میں "دانہ موتی" نے لکھتے ہیں تو آپ کے اس سوال سے کہ آدمی خوشنویس کیسے ہو سکتا ہے

خوشنویسی کی نفی نہیں ہو سکتی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ گھوم پھر کے دیکھیں کہ کیا دنیا میں خوشنویسوں کا وجود پایا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو بھلے مانسی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ یہ سوال کبھی زبان پر نہ لائیں کہ آدمی خوشنویس کس طرح بن سکتا ہے۔

اس اصولی تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ تو اہل فن کے پاس بیٹھیں اور سیکھیں کہ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے"، یا آنکھیں کھول کے تاریخ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ایسے لوگ دنیا میں پائے جاتے رہے یا نہیں۔

فن خوشنویسی کے متعلق جو باتیں کی گئی ہیں وہ امورِ عادیہ میں داخل ہیں اور جو سوال آپ نے پوچھے ہیں وہ خرقِ عادت سے تعلق رکھتے ہیں جب امورِ عادیہ کے ضمن میں غور کرنے کی بجائے محض اعتراض کر دینے سے کام نہیں چلتا تو خرقِ عادات میں "کس طرح ہو سکتا ہے" کہہ دینا کیونکر کارآمد ہو سکتا ہے اگر اسلام کی تاریخ میں صحابہؓ سے لے کر اب تک امورِ خرقِ عادات کا سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو شمار میں نہیں آ سکتے آپ یہ کہہ کر کہ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے"، تاریخ کے اوراق سے ان واقعات کو کیسے کھرچ سکتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ بندہ ایک لاکھ ۳۰ ہزار آدمیوں کے سامنے خطبہ دیتا ہے اور اس کی آواز ہر شخص سُن لیتا ہے آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ایک مقبول بندہ دریائے نیل کو خط لکھتا ہے اور دریا اُس کے اشارے پر چلنا شروع کر دیتا ہے

۳۔ اللہ کے کچھ پیارے بندے ایک جنگل میں جاتے ہیں ان میں سے ایک فرد ایک بلند مقام پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ اے جنگل کے درندوں! ہمیں یہاں رہنا ہے اس لئے یہ جنگل خالی کر دو چنانچہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ درندے اپنے بچوں کو اُٹھائے بھاگے جا رہے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

۴۔ نبی کریمؐ کا ایک غلام فسادات کے دنوں میں مسجد نبویؐ میں محصور ہو جاتا ہے اس کا بیان ہے کہ میرے لئے اوقات نماز معلوم کرنا ناممکن ہو گیا تھا چنانچہ روضۂ اطہر کے اندر سے مجھے اذان سنائی دیتی تھی اور یوں وقت نماز معلوم کر کے میں کئی روز تک نمازیں ادا کرتا رہا آپ کہیں گے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مردے بولیں اور زندے سُنیں۔

خرقِ عادت کی مثالیں کوئی کہاں تک بیان کرے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کریں۔

۱۔ الفتح الربانی ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ مکتوبات امام ربانی ۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
۳۔ الابریز . . . . سید عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ
۴۔ فتوحات مکیہ . . . حضرت ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ
۵۔ تفہیمات الٰہیہ . . شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۶۔ فیوض الحرمین . . ″
۷۔ ضیاء القلوب . . . حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ
۸۔ التکشف عن مہمات التصوف . . حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
۹۔ مجلس ذکر . . . حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ
۱۰۔ الطاف القدس . . . شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

کتابوں کی فہرست محض دو وجوہ سے درج کی گئی ہے اول یہ کہ آپ نے اپنے مکتوب میں اس کا مطالبہ کیا دوسرا یہ کہ آپ چونکہ محقق ہیں اس لئے تحقیق کا تقاضا بھی ہے کہ آپ ریسرچ کریں اگر آپ مقلد ہوتے تو مجتہدین فی الفقہ اور مجتہدین فی التصوف کے فتاوے ہی کافی ہوتے مگر آپ کے لئے مناسب یہی ہے کہ خود تحقیق کر کے کسی نتیجے تک پہنچیں

(جاری ہے)

پروگرام تبلیغی دورہ

شیخ المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ العالیہ

دن اور تاریخ	وقت	روانگی و آمد	عرصہ و مقام قیام
	منٹ — گھنٹہ		
١- جمعرات ٦ر اگست	٣٠ — ٥	روانگی از چکڑالہ برائے فیصل آباد	٦١ پیپلز کالونی
٢- جمعۃ المبارک ٧ر "	٣٠ — ٥	روانگی برائے لاہور۔ مسجد نور داروغہ والا	
٣- اتوار ٩ر اگست	١٠ — ١٢	روانگی برائے کوئٹہ (ہوائی جہاز)	
٤- پیر ١٧ر "	١٠ — ١٢	روانگی برائے راولپنڈی (ہوائی جہاز)	P.١٠٤١ A سیٹلائٹ ٹاؤن
٥- بدھ ١٩ر "	پہلی پرواز	روانگی برائے گلگت (طیارہ)	
٦- ہفتہ ٢٢ر اگست	پہلی پرواز	مراجعت راولپنڈی و چکڑالہ	

تفصیلی پروگرام شیخ المکرم

٩ر اگست تا ١١ر اگست ________ قیام کوئٹہ

١٢ر " تا ١٣ر " ________ قیام نوشکی

١٥ر " ________ قیام پڑلنگا آباد

١٦ر " ________ قیام کوئٹہ

١٧ر تا ١٨ر اگست ________ قیام راولپنڈی

١٩ر تا ٢١ر اگست ________ قیام گلگت

نوٹ :- ذیلی تبلیغی پارٹی کا پروگرام جو مولانا محمد اکرم صاحب، کرنل صاحب اور حافظ عبدالرزاق صاحب پر مشتمل ہوگی

ذیلی تبلیغی پارٹی کا پروگرام

۷ر اگست	———	بعد از نماز جمعہ روانگی از لاہور برائے کوئٹہ بذریعہ کار
۱۰ر "	———	روانگی برائے ژوب (فورٹ سنڈیمن) بذریعہ کار
۱۱ر "	———	واپسی کوئٹہ
۱۲ر تا ۱۷ر اگست	———	شیخ المکرم کے ہمراہ نوشکی مستونگ، پڑنگ آباد
۱۸ر اگست	———	منظفر آباد
۱۹ر تا ۲۲ر اگست	———	ہمراہ شیخ مکرم

کوئٹہ آمد و رفت کے دوران ذیل مقامات پر مختصراً قیام ہوگا۔

۷ر اگست	———	ملتان
۸ر اگست	———	سکھر
۱۵ر اگست	———	سبی
۱۷ر اگست	———	راولپنڈی

نوٹ :- شیخ المکرم کے اس دورے میں جن مقامات پر آپ کا قیام ہوگا وہاں کے اور مضافات کے رفقاء پورے شوق اور اہتمام سے حضرت کے فیض سے مستفیض ہونے کی کوشش کریں اور اپنے دائرۂ اثر و رسوخ میں حق کی آواز پہنچا دیں تاکہ متلاشیانِ حق اس ذریں موقعہ سے فائدہ اٹھا سکیں ۔

(ناظم اعلیٰ)